حجیتِ حدیث

تالیف

استاذ المحدثین مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

تدوین وفہارس

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی

مکتبہ عثمانیہ بیت الحمد ۳۵۲- مہران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

حجیتِ حدیث

تالیف

اُستاذ المحدثین مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

تدوین و فہارس

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی

مکتبہ عثمانیہ بیت الحمد ۳۵۳ مہران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

نام کتاب: حجیت حدیث

مؤلف: مولینا محمد ادریس کاندھلویؒ

تدوین و فہارس: ڈاکٹر محمد سعد صدیقی

طبع دوم: ۱۹۹۶ء

کمپوزرز: اے اے پرنٹرز

۲۹۱ کامران بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: مکتبہ عثمانیہ بیت الحمد

۳۵۳ مہران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ملنے کا پتہ: کتب خانہ جمیلی

۲۹۱ کامران بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پرنٹرز۔ سنت نگر۔ لاہور

حُجیّتِ حدیث

(شریعتِ اسلامیہ میں حدیث کا مقام)

تالیف

اُستاذ المحدثین مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

تدوین و فہارس

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی

مکتبہ عثمانیہ بیت الحمد ۳۵۳ ۔مہران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

فہرست مضامین

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ :

احوال و آثار :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔۔ احوال و آثار

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں شاہدرہ، دہلی، اور سہارنپور ریلوے لائن پر مظفر نگر سے ۵۰، دہلی سے ۶۴ اور سہارنپور سے ۶۵ کلومیٹر کا فاصلہ پر واقع ایک قصبہ ہے جسے "کاندھلہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چالیس پچاس ہزار نفوس پر مشتمل یہ قصبہ برگ و گل کے اعتبار سے زرخیز اور افراد کے اعتبار سے مردم خیز ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کا تعلق بھی اسی مردم خیز قصبہ سے ہے۔ اگرچہ آپ کی جائے پیدائش بھوپال ہے، لیکن آپ کا وطن مالوف کاندھلہ ہے۔ شہر بھوپال میں مولانا ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ/۲۰ اگست ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔

آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے اس طرح آپ صدیقی النسب ہیں، آپ مثنوی مولانا روم کے ساتویں دفتر کے مؤلف مولانا مفتی الہیٰ بخش کی اولاد میں ہیں۔

تعلیم و تربیت

خاندانی روایات کے مطابق مولانا نے قرآن کریم حفظ کیا۔ کاندھلہ میں قرآن کریم کی تکمیل کے بعد آپ نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مدرسہ اشرفیہ تھانہ بھون میں درس نظامی کی ابتدائی کتب کی تعلیم حاصل کی اور پھر مدرسہ عربیہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے۔ مظاہر علوم میں آپ نے مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا حافظ عبداللطیف، مولانا ثابت

علی جیسے جلیل القدر علماء سے استفادہ کیا اور ۱۹ برس کی عمر میں سند فراغ حاصل کی۔ مظاہر علوم سے سند فراغ حاصل کرنے کے بعد ذوق پیدا ہوا کہ دارالعلوم دیوبند میں بھی جو عالم اسلام کی مقتدر ہستیوں کا مرکز تھا، دورہ حدیث کیا جائے چنانچہ مظاہر علوم سے سند فراغ حاصل کرکے دوبارہ دورہ حدیث کیا اور مولانا علامہ انور شاہ کاشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، میاں اصغر حسین دیوبندی، اور مفتی عزیز الرحمن جیسے اجلاء محدثین کے سامنے زانوے تلمذ طے کیا۔

تدریسی زندگی

۱۳۳۸ھ/۱۹۲۱ء سے آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔ مفتی محمد کفایت اللہ کے قائم کردہ مدرسہ امینیہ دہلی سے آپ نے تدریس شروع کی اور ایک سال بعد ہی ارباب دارالعلوم دیوبند نے آپ کو دیوبند میں تدریس کی دعوت دی۔ مادر علمی دارالعوم دیوبند کی تدریس ایک بڑا اعزاز تھا، مولانا نے اس پیش کش کو قبول کیا اور دیوبند فروکش ہوئے۔

دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے سال اول ہی میں آپ نے فقہ کی اعلیٰ ترین کتاب الھدایہ، ادب کی ایک اہم کتاب مقامات حریری جیسی مشکل کتب پڑھائیں۔ دارالعلوم دیوبند سے یہ تعلق کم و بیش نو سال قائم رہا، اس دوران نماز فجر کے بعد نو درہ میں درس قرآن دیتے جس میں دارالعلوم کے متوسط اور اعلی درجات کے طلباء حتی کہ بعض اساتذہ بھی شریک ہوتے۔ اسی درس کی بناء پر آپ کو بیضاوی اور تفسیر ابن کثیر پڑھانے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم چھوڑ کر

حیدر آباد دکن آگئے۔

حیدر آباد دکن میں قیام

حیدر آباد دکن کا نو برس پر مشتمل قیام آپ کی زندگی میں اس اعتبار سے تاریخی گردانا جاسکتا ہے کہ وہاں قیام کے دوران دنیائے علم کے ایک عظیم کتب خانہ، کتب خانہ آصفیہ میں موجود بعض نادر مخطوطات سے استفادہ کرکے عظیم الشان کتاب التعلیق الصبیح علیٰ مشکوٰۃ المصابیح تالیف کی۔

دارالعلوم دیوبند میں

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، صدر مہتمم اور قاری محمد طیبؒ، مہتمم دارالعلوم دیوبند ہوئے تو ان حضرات نے آپ کو بحیثیت شیخ التفسیر دارالعلوم آنے کی دعوت دی جو آپ نے قبول کرلی اور حیدر آباد دکن کے ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ پر ستر روپے ماہانہ کی دارالعلوم کی تدریس کو ترجیح دی اور ۱۹۳۹ء میں دوبارہ دارالعلوم میں آگئے۔ دارالعلوم میں یہ قیام ہجرت پاکستان تک (دس سال) رہا اور وہاں آپ نے تفسیر بیضاوی، تفسیر ابن کثیر، سنن ابی داؤد اور طحاوی کی مشکل الاثار جیسی امہات الکتب پڑھائیں۔

پاکستان ہجرت

مئی ۱۹۴۹ء میں مولانا نے پاکستان ہجرت کرنے کا ارادہ کر کے بادل ناخواستہ دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے دیا، دسمبر ۱۹۴۹ء میں ریاست بہاولپور کی دعوت پر پاکستان آگئے اور جامعہ عباسیہ بہاولپور میں

بحیثیت شیخ الجامعہ تدریسی خدمات کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔

جامعہ عباسیہ میں عصری و دینی تعلیم کے اختلاط کی وجہ سے روحانیت اور للہیت نہ تھی جو دینی مدارس کا خاصہ ہوتی ہے، مولانا کو وہاں کا یہ ماحول اور مادی دوڑ پسند نہ آئی اور جلد ہی طبعیت میں تکدر پیدا ہو گیا۔

جامعہ اشرفیہ سے تعلق

۱۹۵۱ء کے اوائل میں مولانا جامعہ اشرفیہ کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے اور یہاں خطاب فرمایا، مولانا مفتی محمد حسن کی نظر انتخاب نے مولانا کو جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث کے طور پر منتخب کرلیا، چنانچہ بہاولپور واپس جانے کے بعد ایک خط میں مولانا کو جامعہ اشرفیہ آنے کی دعوت ان الفاظ میں دی۔ "میں آپ کو پلاؤ اور بریانی چھوڑ کر دال روٹی کی دعوت دے رہا ہوں"

مولانا نے دال روٹی کی اس مخلصانہ دعوت کو بصد اخلاص قبول کیا مفتی صاحب نے دل کی گہرائیوں سے جو بات کہی تھی، مولانا کے دل پر اثر کر گئی اور مولانا ۱۶ اگست ۱۹۵۱ء کو جامعہ عباسیہ سے کم مشاہرہ پر جامعہ اشرفیہ آگئے اور پھر عمر عزیز کے آخری لمحہ تک جامعہ سے اپنے تعلق کو قائم رکھا۔

وفات حسرت آیات

۱۲ اگست ۱۹۷۳ء کی شب اچانک ہچکیاں آنی شروع ہوئیں۔ ڈاکٹر اور اطباء معائنہ کے بعد اس بات پر متفق ہوئے کہ معدہ بہت کمزور ہو گیا

ہے اور جگر نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ کمزوری میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۲ اگست ۱۹۷۳ء سے جولائی ۱۹۷۴ء تک کا یہ تمام سال اسی طرح کمزوری اور نقاہت کے عالم میں گزرا۔ لیکن شدید مرض اور اضمحلال میں بھی درس بخاری کا سلسلہ بند نہ کیا۔ ۱۶ جولائی ۱۹۷۴ء کو شدید دورہ پڑا اور طبیعت پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اخیر وقت میں جب ذرا ہوش آتا تو کلمہ طیبہ کا ورد ہوتا اور یہ آیت تلاوت کرتے۔ انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ۔ ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء /۸ رجب ۱۳۹۴ھ کو صبح صادق کے وقت طلوع آفتاب سے قبل علم کا یہ آفتاب و ماہتاب اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اسی دن ظہر کی نماز کے بعد نماز جنازہ ہوئی۔ خلف الرشید، والد مرحوم مولانا محمد مالک کاندھلوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور اس طرح اس پیکر علم و عرفان کو سپرد خاک کیا گیا۔ مولانا کی وفات حسرت آیات برصغیر میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً اہل علم پر غم کا ایک پہاڑ بن گئی۔ مولانا کی وفات سے ایک ایسا علمی خلا پیدا ہوا کہ جو بعد میں پورا نہ ہوا۔

تصنیفی خدمات

تصنیف وتالیف میں مولانا کسی خاص میدان کے شہسوار نہیں بلکہ ہر میدان علم میں شہسواری کا ایسا ملکہ رکھتے ہیں کہ گویا زندگی ہی اس میدان میں گذری ہے۔ علم تفسیر، حدیث، عقائد و کلام، سیرۃ نبی کریم، رد فرق باطلہ غرض کہ ہر علمی میدان میں مولانا نے اپنی لازوال خدمات کے ایسے سنگ میل نصب کیئے ہیں کہ جو رہتی دنیا تک قائم رہیں گے۔ مولانا کی چند تصانیف کا اختصار کے ساتھ تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

علم عقائد و کلام

الکلام الموثوق فی ان کلام اللہ غیر مخلوق۔

قرآن کے کلام الٰہی ہونے اور کلام الٰہی کے غیر مخلوق اور قدیم ہونے پر مولانا نے اس رسالہ میں بھر پور علمی، تحقیقی اور مدلل گفتگو کی ہے۔

احسن الحدیث فی ابطال التثلیث

عیسائیت کے نظریہ تثلیث کی تردید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و بشریت پر ایک عظیم تحقیق ہے۔

عقائد اسلام

دین اسلام کے بنیادی و اساسی عقائد جن میں توحید و رسالت، قیامت اور ملائکہ پر ایمان شامل ہیں، پر مشتمل اردو زبان میں ایک منفرد کتاب ہے جو اس مسئلہ میں علمی بحث پر مشتمل ہے۔

علم الکلام

مذہب اسلام کی خصوصیات، احوال قیامت، جنت و جہنم عالم برزخ، حوض کوثر کے وجود پر مدلل و محکم بحث پر مشتمل ہے۔

دستور اسلام

اسلامی نظام حکومت کے بیان پر مشتمل ایک عمدہ کتاب ہے جس میں اسلامی نظام انتخاب، اقتصادی نظام اور تعلیمی نظام پر بحث کی گئی ہے اور نظام حکومت کی اسلامی بنیادوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

سیرۃ و تاریخ

سیرۃ المصطفیٰ

اردو زبان میں لکھی جانے والی سیرت کی کتب میں سے جامع ترین کتب میں سے ہے، تحقیق کے جس مقام پر فائز ہے، مصادر کا جس طرح تتبع کیا گیا ہے، حدیث و سیرت کے اصل مصادر پر جس طرح مبنی ہے، اردو کی کسی دوسری کتاب کو یہ مقام حاصل نہیں۔

خلافت راشدہ

صحابہ کی عظمت خصوصاً خلفاء راشدین کی عظمت پر مولانا نے اس مختصر کتاب میں علمی بحث کی ہے۔

علم تفسیر

معارف القرآن

علوم و معارف کا ایک بھر پور خزینہ اور علماء متقدمین کے علوم کا ایک بہترین مجموعہ ہے۔ مطالب قرآنیہ کی توضیح و تشریح، ربط آیات کا بیان، احادیث صحیحہ اور اقوال و آثار صحابہ و تابعین پر مشتمل تفسیری نکات، ملاحدہ اور زنادقہ کی تردید، ان کے شبہات و جوابات، کلام الہی کی عظمت و شوکت، اس کی جامعیت اور اس کے اعجاز کا بیان، یہ چند خصوصیات ہیں جو معارف القرآن میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ۲۴ شوال المکرم ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء میں اس تفسیر کی تالیف کا آغاز کیا گیا اور ابھی سورۃ صفت کے اختتام تک پہنچے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ خلف الرشید مولانا محمد مولانا مالک کاندھلویؒ نے اسے مکمل کیا۔

الفتح السماوی بتوضیح تفسیر البیضاوی

ساتویں صدی ہجری کے مفسر قرآن قاضی ناصرالدین ابوالخیر عبد بن عمر الشیرازی البیضاوی م۶۸۵ء کی مرتب کردہ تفسیر انوار التنزیل و اسرار التاویل ہمیشہ علماء مفسرین کی توجہ کا مرکز رہی ہے اور اس پر متعدد تعلیقات کی گئیں اور بہت سی شروح لکھی گئیں۔ ۲۰ شوال ۱۳٦۰ھ کو اس کتاب کی تالیف کا آغاز کیا گیا یہ تفسیر ہنوز زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی اور اس کا واحد مخطوطہ ادارہ اشرف التحقیق میں موجود ہے۔

بیضاوی کی توضیح اور اس کے ادق نکات کی تشریح میں یہ کتاب ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔

مقدمہ التفسیر

اصول وتاریخ تفسیر پر ایک جامع اور مفصل رسالہ ہے جو ابھی تک مخطوط شکل میں ہے۔

علم حدیث

تحفتہ القاری بحل مشکلات البخاری

بخاری کے مشکل مقامات خصوصا تراجم ابواب جو امام بخاری کی ایک امتیازی شان ہے، کی توضیحات پر مشتمل ہے۔ اس کے تین اجزاء طبع ہو چکے ہیں جب کہ بقیہ اجزاء ابھی طبع نہیں ہو سکے۔

التعلیق الصبیح علی مشکوۃ المصابیح

ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب کی کتاب مشکوۃ المصابیح

مجموعہائے حدیث میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ علماء نے اس کتاب کی جس قدر شروح لکھی ہیں، شاید کسی اور کتاب کو یہ سعادت حاصل نہ ہوئی ہو۔ مولانا نے اس کتاب میں مشکوۃ کی عمدہ اور آسان زبان میں بلیغ پیرایہ میں توضیح و تشریح کی ہے۔ مولانا کی حیات میں اس کتاب کے چار ابتدائی اجزاء دمشق میں اور چار اجزاء پاکستان میں شائع ہوئے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد یہ کتاب از سر نو سات جلدوں میں مکمل طبع ہوئی ہے۔

حجیت حدیث

حدیث کی قطعیت، اس کی حجیت اور اس کا مصدر شرعی ہونا اس پر مولانا نے اپنی اس کتاب میں دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے بڑی بھر پور بحث کی ہے اور یہ کتاب منکرین حدیث کے لیے ایک مسکت جواب ہے۔ مولانا کی یہ مختصر مگر مدلل اور پر مغز کتاب عرصہ سے نایاب تھی، تدوین و تعلیق کے ساتھ اسکی اشاعت قارئین کے لیے بیحد مفید ہوگی، اس خیال سے اس کی تدوین کی گئی اور تدوین میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا۔

(١) کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے، حصہ اول دلائل پر مشتمل ہے اور حصہ دوم میں منکرین حدیث کے شبہات اور ان کے جوابات شامل ہیں۔

(٢) دلائل کے حصہ میں ہر دلیل کو عنوان بھی دیدیا گیا ہے۔

(٣) حوالہ جات مکمل کیے گئے ہیں۔

(٤) آیات واحادیث کی مکمل تخریج کی گئی ہے۔

(٥) فارسی، عربی اشعار، عبارات کے جہاں ترجمہ نہیں تھے، تحریر کردیے گئے ہیں۔

(۶) مشکل الفاظ کی وضاحت حاشیہ میں کردی گئی ہے۔
(۷) قابل توضیح عبارات کی وضاحت کردی گئی ہے اور جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی، حاشیہ میں کچھ اضافات کردیے گئے ہیں۔
(۸) آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کی فہرست ابجدی ترتیب سے آخر میں اشاریہ میں دیدی گئی ہے۔
(۹) ماخذ و مصادر کی فہرست دیدی گئی ہے۔
(۱۰) مولانا نے اقبال کے ایک شعر کی تضمین میں فارسی کے چھیاسی اشعار کہے ہیں، ان اشعار کا ترجمہ مولانا مشرف علی تھانوی کی معاونت و راہنمائی میں کرکے دیا گیا ہے۔ قارئین اگر اس میں کوئی غلطی محسوس فرمائیں تو بلا تکلف مدوّن کو مطلع فرمائیں۔

فتلک عشرة کاملة

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے، قارئین کے لیے مفید، ناچیز کے لیے ذخیرہ آخرت، اور مولانا کے درجات عالیہ میں بلندی کا سبب بنائے۔ آمین

واللہ المستعان علی ما تصفون

محمد سعد صدیقی

۵ محرم الحرام ۱۴۱۷ھ

۲۳/ مئی ۱۹۹۶ء

مقدمہ !

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العلمین والعاقبة للمتقین والصلوۃ والسلام علیٰ سیدنا و مولانا محمدَ خاتم الانبیاء والمرسلین و علی آلہ و اصحابہ اجمعین و علینا معھم یا ارحم الراحمین.

امابعد

بندہ با بکار و گنہگار و امید وار رحمت پروردگار عالم و چشم بر براہ شفاعت نبی اکرم محمد مصطفی ﷺ۔ محمد ادریس کاندھلوی کان اللہ لہ و کان ہوللہ آمین.

اہل اسلام کی خدمت میں بحق اخوت اسلام عرض پرداز ہے کہ اس دور پر فتن میں طرح طرح کے فتنے نمودار ہو رہے ہیں، لہذا اپنے ایمان اور اسلام کی دولت سے ہوشیار اور باخبر رہیں کہ کوئی اچک کر نہ لے جائے۔ اللہ تعالیٰ ہر فتنہ سے محفوظ رکھے آمین ثم آمین۔

اس وقت جو ایک فتنہ نمودار ہے، وہ انکار حدیث کا فتنہ ہے۔ منکرین حدیث کا گروہ جو "فرقہ قرآنیہ"[1] کے نام سے موسوم ہے وہ اس فتنہ کا بانی و مبانی ہے پہلے بھی یہ فتنہ اٹھ چکا ہے[2] لیکن اس وقت میں اور پہلے میں یہ فرق ہے کہ پہلے فقط حدیث نبوی کے منکر تھے، لیکن اس وقت

---

(۱) منکرین حدیث اپنے آپ کو منکر حدیث کے بجائے اہل قرآن کہتے ہیں

(۲) ابن حزم فرماتے ہیں کہ اہل سنت، خوارج، شیعہ، قدریہ تمام فرقے آنحضرت ﷺ کی ان احادیث کو جو ثقہ راویوں سے منقول ہوں، برابر قابل حجت سمجھتے رہے، یہاں تک کہ پہلی صدی کے بعد متکلمین معتزلہ آئے اور انہوں نے اس اجماع کے خلاف کیا۔ دیکھئے ابن حزم، الاحکام، ج ۱: ص ۱۱۴۔ یعنی انکار حدیث کا فتنہ سب سے پہلے دوسری صدی ہجری کے آغاز میں ظاہر ہوا

کے منکرین حدیث، حدیث نبوی اور صحابہ کرام اور امت محمدیہ کے چودہ قرون کے محدثین اور مفسرین کے استہزاء اور تمسخر پر بھی تلے ہوئے ہیں۔ اور ان علماء ربانیین کی تحمیق و تجہیل اور تحقیر و تذلیل میں ان کا قلم رواں دواں ہے کہ جن کی علماء اولین اور آخرین میں کوئی نظیر نہیں جس کا جی چاہے امام مالک[۱]، امام بخاری[۲] اور امام مسلم[۳] رحمہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ دل کھول کر تمسخر کرلے مگر یہ یاد رکھے۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد میلش اندر طعنۂ پاکاں زند

حلم حق با تو مواسابا کند چوں زحدت بگذری رسوا کند

یورپ کے مؤرخین کا استہزاء و تمسخر تو خلاف تہذیب ہے مگر حضرات محدثین کا استہزاء عین تہذیب ہے۔

خسرو پرویز نے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا والانامہ چاک کیا اور اس کو پارہ پارہ کیا اللہ نے اس کو پارہ پارہ کیا[۴] خسرو پرویز کے نام جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے والا نامہ روانہ فرمایا تھا وہ آپ نے خود اپنے دست مبارک سے نہیں لکھا تھا اس لئے کہ آپ تو نبی امی تھے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صحابہ رضی اللہ عنہ ہی سے لکھوا کر بھیجا تھا اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث طیبہ بھی ہم کو صحابہ رضی اللہ عنہ اور تابعین رحمہ اللہ ہی کے ہاتھوں کی

---

(۱) مالک بن انس م ۱۷۹ھ۔

(۲) محمد بن اسماعیل البخاری م: ۲۵۶ھ۔

(۳) مسلم بن الحجاج القشیری م: ۲۶۱ھ۔

(۴) سنہ ۶ ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف بادشاہوں کے نام دعوت اسلام کے مراسلات بھیجے تھے۔ خسرو پرویز نے جو ایران کا بادشاہ تھا، آپ کا نامہ مبارک کو پھاڑ دیا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کی مضبوط سلطنت کو پارہ پارہ کردیا۔

لکھی ہوئی پہنچی ہیں، ان کو سر اور آنکھوں پر رکھنا اور بوسہ دینا چاہیے۔ ابو لہب تبت یداہ مکہ کے گلی کوچوں میں یہی کہتا پھرتا تھا کہ اے لوگو! تم محمد ﷺ کی کوئی بات (حدیث) نہ سننا منکرین حدیث بھی آج گلی کوچوں میں یہی ڈھنڈورا پیٹتے پھر رہے ہیں کہ یہ سب حدیثیں خرافات اور مفتریات کا انبار ہیں قابل اعتبار نہیں ابو جہل بھی یہی کہتا تھا کہ اے محمد ﷺ میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا مگر جو تم کہتے ہو اس کو صحیح نہیں سمجھتا اسی طرح منکرین حدیث کہتے ہیں کہ ہم حضور پر نور ﷺ کو نبی صادق سمجھتے ہیں مگر حضور ﷺ کے فرمان کو صحیح نہیں مانتے۔ "لعمرک انهم لفی سکرتهم یعمهون"[1]. (آپ کی جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش تھے) "وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون"[2]. (اور عنقریب ان ظالموں کو معلوم ہوجائے گا کہ کیسی جگہ ان کو لوٹ کر جانا ہے)

اہل اسلام کا عقیدہ

عہد نبوت سے لے کر اس وقت تک تمام امت محمدیہ کے علماء و صلحاء اور عوام و خواص سب کا یہ عقیدہ رہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک رہے گا، کہ حضور پر نور ﷺ کی ذات بابرکات آفتاب نبوت و رسالت ہے، آپ ﷺ کا وجود باجود تمام عالم کے لیے رحمت ہے، آپ ﷺ کی حدیث اور سنت امت کے لیے حجت اور مشعل ہدایت ہے، آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ کا اتباع کیمیائے سعادت اور کلید جنت ہے آپ ﷺ کا عشق اور آپ ﷺ کی محبت آخرت میں موجب شفاعت اور جنت میں باعث معیت و مرافقت ہے۔

---

(۱) ۱۵: الحجر: ۷۲۔ (۲) ۲۶: الشعراء: ۲۲۷

"و من يطع الله والرسول فاؤلئک مع الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهدآء والصلحين و حسن آولئک رفيقاً. ذالک الفضل من الله و کفیٰ بالله عليماً"[1]. (اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی جنت میں، ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے (کامل) انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء (علیہم السلام) اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں یہ فضل ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والے ہیں)۔

منکرین حدیث کا عقیدہ

منکرین حدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ معاذ اللہ ثم معاذاللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت محض ایک قاصد اور ڈاکیہ کی سی ہے[2] اللہ کا پیغام پہنچادینے کی بعد نبی کو لوگوں سے کچھ کہنے سننے کا حق باقی نہیں رہتا خدائے تعالیٰ کا پیغام پہنچادینے کے بعد نبی کی حیثیت عام انسان کی سی ہوجاتی ہے گویا نبی اور امتی سب برابر ہوجاتے ہیں کفار لئام ہمیشہ سے حضرات انبیاء کرام علیہ السلام سے یہی کہتے آئے۔

"قالوا ما آنتم الا بشر مثلنا"[3]. (کفار نے انبیاء کرام سے یہ کہا کہ نہیں ہو تم مگر ہم جیسے آدمی یعنی ہم کیوں تمہاری سنیں اور کیوں تمہاری اطاعت کریں)۔

---

(۱) ۴: النساء: ۶۹

(۲) منکرین حدیث کا یہ نظریہ اگر بالفرض مان لیا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے قاصد ہیں اور جب کوئی قاصد کسی دوسرے کے پاس کسی کا پیغام لے کر آتا ہے اور اس پیغام میں کوئی بات وضاحت طلب ہو تو سب سے پہلے اسی قاصد کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اس قاصد کی طرف سے بیان کردہ توضیح و تشریح کو سب سے زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔

(۳) ۱۴: ابراہیم: ۱۰

ہمسری با انبیاء برداشتند　　اولیاءؑ را ہمچو خود پنداشتند
گفت اینک ما بشر ایشاں بشر　　ماوَ ایشاں بستۂ خوابیم و خور [1]

منکرین حدیث کہتے ہیں کہ منصب نبوت و رسالت کے اعتبار سے نبی کی کوئی دینی اور شرعی حیثیت نہیں بلکہ نبی مسلمانوں کا امیر جماعت اور ناظم ہونے کی حیثیت سے واجب الاطاعت ہے جیسے ہر زمانہ میں امیر کی اطاعت واجب ہوتی ہے اسی طرح نبی بھی اپنے زمانہ کا امیر اور حاکم ہوتا ہے اسی حیثیت سے اس کی اطاعت واجب اور لازم ہوتی ہے باقی نبی ہونے کی حیثیت سے نبی کا کوئی قول اور فعل حجت نہیں۔ صرف اللہ کا حکم واجب العمل ہے۔ "ان الحکم الاللّٰہ" [2]۔

سوائے اللہ کے کسی کا حکم نہیں۔ غیر اللہ کے حکم کو ماننا شرک ہے۔ کیا ان مدعیان قرآن کے قرآن میں یہ آیت نہیں؟

"من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ"[3]. (جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی)۔

منکرین حدیث کا مقصود، قرآن کریم کا اتباع نہیں بلکہ توحید کی آڑ لے کر نبوت سے کنارہ کش ہونا چاہتے ہیں کیا "اشھد ان محمد عبدہ ورسولہ" کا اقرار "اشھدان لا الہ الا اللّٰہ" کے منافی اور مباین ہے؟[4]۔

انکار حدیث کی اصل وجہ

انکار حدیث کی یہ وجہ نہیں کہ حدیث ہم تک معتبر ذریعہ سے نہیں

---

(۱) انبیاء کے ساتھ کا برابری کا دعویٰ کرتے ہیں اولیاء کو اپنے جیسا شمار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ بھی بشر ہیں، ہم بھی بشر ہیں، ہم اور وہ سونے اور کھانے کے مشغلہ میں بندھے آئے ہیں

(۲) ۶: الانعام: ۵۷　(۳) ۴: النساء: ۸۰　(۴) مباین: متصادم، متضاد

پہنچی بلکہ انکار حدیث کی اصل وجہ یہ ہے کہ طبیعت میں آزادی ہے۔ آزاد رہنا چاہتی ہے نفس یورپ کی تہذیب اور تمدن پر عاشق اور فریفتہ ہے۔ اور انبیاء و مرسلین کے تمدن سے نفور اور بیزار ہے کیونکہ شریعت غراء، ملت بیضاء، احادیث نبویہ اور سنن مصطفویہ قدم قدم پر شہوات نفس میں مزاحم ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اولین مقصد نفسانی خواہشوں کا کچلنا اور پامال کرنا ہے اس لئے کہ شہوتوں کو آزادی دینے سے دین اور دنیا دونوں ہی تباہ ہوجاتے ہیں اس لئے منکرین حدیث نے ان دو متضاد راہوں میں تطبیق کی ایک نئی راہ نکالی وہ یہ کہ حدیث کا تو انکار کردیا جائے جو ہماری آزادی میں سد راہ ہے اور مسلمان کہلانے کے لیے قرآن کریم کا اقرار کرلیاجائے کیونکہ قرآن کریم ایک اصولی اور قانونی کتاب ہے، اسکی حیثیت ایک دستور اساسی کی ہے کہ جو زیادہ تر اصول اور کلیات پر مشتمل ہے جس میں ایجاز[1] اور اجمال[2] کی وجہ سے تاویل کی گنجائش ہے اور احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ میں ان اصول اور کلیات کی شرح اور تفصیل ہے اس میں تاویل کی گنجائش نہیں اس لئے اس گروہ نے حدیث نبوی کا تو انکار کردیا اور مسلمان کہلانے کے لیے قرآن کریم کو مان لیا اور اس کے مجملات اور موجز کلمات میں ایسی من مانی تاویلیں کیں

---

(۱) ایجاز: قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں سے ہے علامہ قزوینی کے مطابق کسی خاص مقصد کو ادا کرنے کے لیے کلام یا تو طویل ہوتا ہے، ضرورت کے مطابق ہوتا ہے اور بعض اوقات الفاظ کم ہوتے ہیں لیکن مقصد و معانی کے بیان میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا۔ جیسے آیت ولکم فی القصاص حیوۃ یا اولی الالباب نہایت مختصر الفاظ لیکن معانی کا ایک سمندر ان میں پنہاں ہے۔

(۲) بعض اوقات مختصر الفاظ میں کسی واقعہ کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے۔

کہ جس میں ان کے اسلام اور یورپ کے کفر اور الحاد میں کوئی منافات ہی نہ رہی "وذلک غایۃ طلبھم و نہایۃ طربھم"

افسوس اور صد افسوس

کہ مجوسی اور بت پرست، یہودی اور صلیب پرست تو اپنے مذہبی مسائل کے ثبوت کے لیے اپنے مقتدا اور پیشوا کے اقوال اور افعال اور اس کے کلمات اور ملفوظات کے حجت اور سند سمجھتا ہے مگر ایک مدعی اسلام جو زبان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا مقتدا اور پیشوا بھی مانتا ہے وہ آپ کی حدیث اور سنت کو حجت اور واجب العمل نہیں سمجھتا۔

کیا یہ منصب نبوت کے ساتھ استہزاء اور تمسخر نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا مقتدا تو مانیں مگر آپ کی کوئی بات نہ مانیں اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ "حضور آپ میرے مقتدا اور پیشوا ہیں مگر آپ کا کوئی قول اور فعل میرے لیے حجت اور واجب العمل نہیں میرے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے آپ اللہ کی کتاب ہم تک پہنچانے کے لیے آئے تھے وہ فریضہ ادا ہوچکا اب آپ کو ہم سے کوئی واسطہ نہیں ہم جانیں اور ہمارا خدا جانے۔ اللہ نے ہم کو بھی عقل دی ہے ہم خود قرآن کا مطلب سمجھ لیں گے۔ ہمیں آپ کی تفسیر اور توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں اور آپ کے صحابہ کی تفسیر ہم پر حجت نہیں۔ ہم غور کریں گے اگر مناسب سمجھا تو قبول کریں گے ورنہ ہم کو معاف رکھا جائے" یہ ہے منکرین حدیث کا مذہب اور مشرب۔ "کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا"[1]

---

(۱) ۔۔۔ ۱۸:۵

اے مسلمانو! تم نے سن لیا اور دیکھ لیا کیا یہ منصب نبوت و رسالت کے ساتھ کھلا ہوا استہزاء اور تمسخر نہیں[۱]؟

منکرین حدیث سے ایک سوال

منکرین حدیث یہ بتلائیں کہ جب نبی کا قول حجت[۲] نہیں تو نبی کا یہ قول کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے کیسے حجت ہوا۔ قرآن کا کلام اللہ ہونا بھی تو نبی ہی کے قول سے معلوم ہوا جو ایک شخص کی خبر ہے اور خبر واحد ظنی ہوتی ہے اور ظن حجت نہیں۔ قرآن کریم کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب نبی ہی کے بتلانے سے تو معلوم ہوئی۔

نیز قرآن کریم کے کاتب[۳] اور راوی[۴] بھی وہی حضرات صحابہ و تابعین ہیں جو حدیث نبوی کے کاتب اور راوی ہیں۔ جو آپ کے نزدیک حجت نہیں اور جو شکوک اور شبہات احادیث کی روایت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ وہ شکوک اور شبہات قرآن کریم کی روایت اور سند میں بھی جاری ہوسکتے ہیں تو کیا قرآن کی حجیت سے بھی دست بردار ہونے کا ارادہ ہے؟

فتنہ انکار حدیث کی پیشین گوئی

حسب ارشاد باری "تلک من انباء الغیب نوحیھا الیک"[۵]

---

(۱) استہزاء: مذاق، تمسخر: مسخراپن، توہین آمیز سلوک۔

(۲) حجت: مسلم قانونی حیثیت۔

(۳) نبی کریم ﷺ امی تھے، لکھنا نہ جانتے تھے اس لیے لکھنے کے ماہر صحابہ پر مشتمل کاتبین وحی کی ایک جماعت تھی جو علامہ سیوطی کے مطابق ۴۰ صحابہ پر مشتمل تھی۔ دیکھئے الاتقان، ج۱: ص۔

(۴) راوی: حدیث بیان کرنے والے

(۵) ۱۱: ھود: ۴۹

آنحضرت ﷺ نے بہت سے آئندہ حوادث اور فتن کی خبر دی جو کتب احادیث میں مذکور ہیں اور جس طرح حضور ﷺ نے ان کی خبر دی اسی طرح ان کا ظہور ہوا سر موان میں فرق نہیں آیا جس سے حضور ﷺ پر نور کا صادق و مصدوق ہونا دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دیگر فتن کی طرح حضور ﷺ نے فتنہ انکار حدیث کی بھی خبر دی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

لاالفین احدکم متکئا علی اریکت یا تیہ الامر من امری مما امرت بہ او نہیت عنہ فیقول لا ادری ما وجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ[۱]۔

(حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہ پاؤں میں تم سے کسی کو کہ اپنی اپنی مسند پر بیٹھ کر (ایسا مغرور ہوجائے کہ جب) میرا حکم اس کے پاس پہنچے تو (تکبر اور نخوت سے حقارت آمیز لہجہ میں) یہ کہے کہ میں نہیں جانتا کہ یہ کیا حکم ہے۔ ہم جو قرآن میں پائیں گے فقط اس کی پیروی کریں گے)۔

یہ حدیث سنن ابی داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور دلائل النبوۃ بیہقی میں ابو رافعؓ سے مروی ہے اور مقداد بن معدیکرب کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں "الا انی اوتیت القرآن و مثلہ معہ"[۲] آگاہ ہوجاؤ کہ مجھ کو قرآن دیا گیا اور بمقدار قرآن کے اور بھی احکام شریعت مجھ کو دیے گئے۔ فتنہ کوئی نیا فتنہ نہیں سلف کے عہد میں بھی ایسے ملحد اور زندیق ہوئے ہیں کہ حدیث نبوی کے منکر تھے علماء ربانیین نے ان کا جواب اور رد لکھا سب

---

(۱) ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ: (۱۳) ج۱: ص۶، ۷۔ باب تعظیم حدیث رسول اللہ ﷺ (۲) مقدمہ۔

(۲) بیہقی، ابوبکر محمد بن حسین، دلائل النبوۃ، ج۶: ص۵۴۹۔

سے پہلے امام شافعی[1] رحمہ اللہ اپنے رسالہ میں اس فرقہ ضالہ (گمراہ) کی طرف توجہ فرمائی اور قرآن کریم سے حدیث نبوی کا حجت اور مستند ہونا بیان فرمایا اور دسویں صدی میں شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے خاص اسی موضوع پر مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ کے نام سے ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزاء خیر دے اوران کی قبروں کو منور فرمائے آمین۔

انہی حضرات کی رہنمائی سے یہ ناچیز بھی اہل اسلام کی خدمت میں احادیث نبویہ کا حجت ہونا قرآن کریم سے ثابت کرنا چاہتا ہے۔ انشاء اللہ ثم انشاء اللہ حق تعالیٰ کی رحمت سے امید واثق ہے کہ جب اہل فہم قرآن کریم کی آیات بینات کی روشنی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال اور حرکات و سکنات کا واجب الاطاعت اور مشعل ہدایت ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو حجیت حدیث کے بارہ میں شکوک و شبہات کی تمام ظلمتیں خود بخود کافور ہوجائیں گے۔ اولاً ہم قرآن کریم کی آیات بینات سے حدیث کا حجت ہونا بیان کریں گے اور ثانیاً ان شکوک اور شبہات کے جوابات دیں گے جو لوگوں کے لئے گمراہی کا سبب بن رہے ہیں "ان ارید الا الاصلاح ما ستعطت و ما توفیقی الا باالله علیه توکلت والیه انیب"[2]۔

---

(۱) محمد بن ادریس الشافعی: م ۲۰۴ھ (۲) ۱۱: ھود: ۸۸

یعنی اس تحریر سے ہمارا مقصود کسی شخص یا گروہ کی دل آزاری نہیں اور نہ ہی اس تحریر کو کو امت میں تفرقہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ اپنی استطاعت وقوت کی حد تک امت مسلمہ کو گمراہی سے بچانے، صحیح نظریہ کی رہنمائی اور ان کی نظریاتی اصلاح کی ایک کوشش ہے۔ اس کی توفیق اللہ ہی نے دی اسی پر بھروسہ ہے اور اسی طرف مکمل توجہ۔

حصّہ اوّل

دلائل حجیتِ حدیث :

دلائل حجیتِ حدیث از قرآن کریم

دلیل:۱

اللہ اور رسول پر ایمان

قرآن کریم میں جا بجا ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول کو بھی فرض اور لازم قرار دیا ہے، ملائکہ مکرمین کی طرح انبیاء و مرسلین پر ایمان لانے کو مدار نجات ٹھہرایا ہے اور سلسلہ ایمان کے بیان میں[1] خداوند ذوالجلال، ملائکۃ اللہ، کتب الٰہیہ، صحف سماویہ اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سب کو ملا کر بیان فرمایا ہے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح کتب الٰہیہ اور ملائکۃ اللہ کی وحی حجت ہے اسی طرح انبیاء کرام کے ارشادات بھی قطعاً حجت ہیں جس شئے پر ایمان لانا فرض اور لازم ہوگا وہ قطعاً حجت ہوگی لہذا اگر نبی کے اقوال و افعال حجت نہ ہوتے تو پھر قرآن کریم میں نبی اور رسول پر ایمان لانے کا حکم بھی نہ ہوتا بلکہ صرف کتاب اللہ پر ایمان لانا کافی ہوتا اس لیے کہ ایمان لانا اسی شئے پر

---

(۱) کما قال تعالیٰ: فامنوا باللّٰہ ورسولہ و لا تقولوا ثلثۃ (۴: النساء :۱۷۱)

وقال تعالیٰ: انما المؤمنون الذین آمنوا باللّٰہ ورسولہ واذا کانوا معہ علے امر جامع لم یذھبوا حتی یستاذنوہ(۲۴: النور:۶۲)

وقال تعالیٰ: آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون کل آمن باللّٰہ وملائکتہ وکتبہ ورسولہ لا نفرق بین احد من رسلہ وقالوا سمعنا و اطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر (۲:البقرہ: ۲۸۵)

وقال تعالیٰ: والذین آمنوا باللّٰہ ورسلہ و لم یفرقوا بین احد منھم اولئک سوف نوتیھم اجورھم. (۴: النساء : ۱۵۲)

واجب ہوتا ہے کہ جو حجت قاطعہ[۱] اور واجب التسلیم[۲] ہو ورنہ جو شئے حجت نہ ہو اس پر ایمان لانا بے سود ہے۔

منکرین حدیث کے نزدیک منصب نبوت کے اعتبار سے نبی کی کوئی تشریعی حیثیت نہیں اور نہ منصب نبوت کی حیثیت سے اس کی اطاعت واجب ہے، نبی چونکہ اپنے زمانہ کا امیر اور حاکم ہوتا ہے اس لیے اس کی اطاعت لازم ہے یہ ایسا بدیہی البطلان[۳] عقیدہ ہے کہ جس کو ایک معمولی پڑھا ہوا انسان بھی قبول نہیں کرسکتا اس لیے کہ سارا قرآن ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کے حکم سے بھرا پڑا ہے جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ خدا تعالیٰ پر بحق الوہیت اور نبی اور رسول پر بحق نبوت و رسالت، ایمان لانا ضروری ہے پس جس طرح اللہ کے احکام کو بحق الوہیت، ماننا فرض ہے۔ اسی طرح نبی اور رسول کے احکام کو بحق نبوت و رسالت، ماننا فرض ہے منکرین حدیث منصب نبوت و رسالت کی حقیقت اور جلالت ہی سے بے خبر ہیں اس لیے قول رسول کو حجت نہیں سمجھتے۔

دلیل : ۲

انبیاء پر ایمان نہ لانے والوں کی تکفیر

نیز اگر نبی کے اقوال و افعال حجت نہ ہوتے تو نبی کے نہ ماننے والے کافر ہی نہ ہوتے حالانکہ قرآن کریم انبیاء کرام پر نہ ایمان لانے

---

(۱) حجت قاطعہ: قطعی دلیل، آخری دلیل

(۲) واجب التسلیم: جس کو ماننا ضروری ہو

(۳) بدیہی البطلان: صاف واضح طور پر غلط

والوں کی تکفیر و تضلیل اور تحمیق و تجہیل سے بھرا پڑا ہے اور نہ انبیاء کرام کی تکذیب کرنے والوں پر خدا کا کوئی قہر اور عذاب نازل ہوتا۔

دلیل: ۳

نبی کے فیصلہ پر رضامندی

فلاوربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما[(۱)].

(قسم ہے تیرے پروردگار کی ہرگز نہیں مومن ہوسکتے جب تک اپنے باہمی نزاعات میں تجھ کو حکم اور منصف نہ جانیں اور پھر تیرے فیصلہ سے اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی اور ذرہ برابر انقباض نہ پائیں اور دل و جان سے تیرے فیصلہ کو تسلیم کریں) یعنی تب مومن ہوں گے ورنہ نہیں۔

حق جل شانہ نے اس آیت میں نبی کی تحکیم اور دل و جان سے اس کے فیصلہ کے قبول و تسلیم کو مدار ایمان قرار دیا ہے اگر قرآن کریم میں متنازع فیہ شے کا فیصلہ موجود تھا تو پھر نبی کی تحکیم کی کیا ضرورت رہی فقط قرآن کریم کی آیت پڑھ دینا کافی ہوگا۔

---

(۱) ۴: النساء: ۶۵

علامہ ابن کثیر اس آیت کے شان نزول میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک یہودی اور منافق کا جھگڑا ہوا، جس میں یہودی حق پر تھا، نبی کریم ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دیدیا یہ دونوں پہلے صدیق اکبر اور پھر فاروق اعظم کے پاس گئے۔ فاروق اعظم گھر میں گئے اور تلوار لاکر منافق کی گردن اڑادی اور کہا کہ جو نبی کے فیصلہ پر راضی نہیں اس کا فیصلہ عمر نہیں، عمر کی تلوار کرتی ہے۔ دیکھئے ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم ج ۱: ص ۵۲۱

دلیل: ۴

اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ماکان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللّٰہ ورسوله امرا ان یکون لهم الخیرة من امرهم. و من یعص اللّٰہ ورسوله فقد ضل ضللا مبینا[۱].

(کسی مؤمن مرد اور عورت کو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کے بعد کوئی اختیار نہیں یعنی اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کا ماننا فرض اور لازم ہے اور جس نے اللہ اور رسول کے حکم کو نہ مانا وہ صریح طور پر گمراہ ہوا)۔

اس آیت میں مؤمن اور مؤمنہ کے لیے دو فیصلوں کا ماننا لازم ایمان قرار دیا گیا ہے ایک اللہ کا فیصلہ۔ اور ایک رسول کا فیصلہ۔ پس اگر رسول کا قول و فعل حجت نہیں تو اس کا فیصلہ ہی کیسے حجت، واجب التسلیم اور لازم ایمان ہوگا معلوم ہوا کہ قضاء رسول قرآن کریم کے علاوہ ایک مستقل حجت ہے جس کو ماننا مدار ایمان[۲] ہے اور قرآن کریم میں دوسری جگہ نبی کریم کے فیصلہ سے اعراض کرنے کو کفر اور نفاق فرمایا

---

(۱) ۳۳: الاحزاب: ۳۶

اس آیت کی تشریح کے ضمن میں غلام احمد پرویز نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ رسول کی ذاتی رائے یا مشورہ سے اختلاف کا حق حاصل ہے اور اس باب میں زید کا واقعہ بین مثال ہے۔ دیکھیے پرویز، غلام احمد، مفہوم القرآن، لاہور، ۱۹۶۱۔ ص ۹۷۴، ۷۵۔ پرویز کا یہ موقف قرآن کریم کی صریح آیات، حدیث کی تعلیمات اور اجماع امت کے خلاف ہے۔

(۲) مدار ایمان: ایمان کی بنیاد

ہے کما قال تعالیٰ: و اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون[1]. (اور یہ لوگ جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف اس غرض سے بلائے جاتے ہیں کہ رسول ان سے جھگڑوں کا فیصلہ کردے تو ان میں ایک گروہ پہلو تہی کرتا ہے)۔

دلیل: ۵

اطاعت رسول ہی دراصل اطاعت الٰہی ہے

قرآن کریم میں رسول کو واجب الاطاعت[2] قرار دیا ہے اور جا بجا اطاعت رسول کو اطاعت خداوندی کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا ہے۔

ومآارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ[3] (اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے کہ بیچون و چرا اس کی اطاعت کی جائے اسی طرح اللہ کا حکم ہے)۔

اور یہ نہیں فرمایا و مانزلنا من کتاب الا لیعمل بہ یعنی ہم نے فقط قرآن کو عمل کے لیے نازل کیا ہے۔

یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول[4]. (اے ایمان والو ایمان کا مقتضی ہی یہ ہے کہ تم اللہ کی اطاعت کرو اور نیز اس کے رسول کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو)۔

---

(۱) ۲۴: النور: ۴۸

(۲) واجب الاطاعت: جس کی فرمانبرداری ضروری اور حکم عدولی ناجائز ہو۔

(۳) ۴: النساء: ۶۴

(۴) ۴: النساء: ۵۹

لغت میں اطاعت کے معنی طوع اور رغبت اور دلی رابطہ سے حکم بجا لانے کا نام ہے محض ضابطہ پری کو اطاعت نہیں کہتے[۱] بلکہ قرآن کریم نے اطاعت رسول کو عین اطاعت خداوندی اور بیعت رسول کو عین بیعت خداوندی قرار دیا ہے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ[۲]. (جو رسول کی اطاعت کرے اس نے در حقیقت اللہ ہی کی اطاعت کی)۔

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ یداللہ فوق ایدیھم[۳]. (تحقیق جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ در حقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے)۔

دست او را حق چو دست خویش خواند — تا ید اللہ فوق ایدیھم براند[۴]

ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ[۵]. (اور آپ نے خاک نہیں پھینکی جس وقت کہ آپ نے پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی)۔

حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدر میں کافروں کی طرف "شاہت الوجوہ"

---

(۱) اطاعت کا مادہ "طوع" ہے جس کی لغوی وضاحت کرتے ہوئے امام راغب کہتے ہیں کہ طوع سے مراد سر تسلیم خم کرنا ہے اور اس کا مقابل کرہ (زبردستی) آتا ہے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو فرمایا تم آؤ میرے پاس خوشی کے ساتھ یا مجبوری میں۔ راغب کی اس تحریر سے واضح ہوا کہ طاعت کے لفظ میں ہی یہ بات پائی جاتی ہے کہ یہ فرمانبرداری اور تسلیم و رضا کسی بیرونی جبر کے نتیجہ میں نہ ہو بلکہ انسان کے اندر پائے جانے والے اس جذبہ کی وجہ سے ہو اس کو احکام کی پابندی پر آمادہ کرتا ہے۔ دیکھئے راغب، مفردات، ص ۳۱۰

(۲) ۴: النساء: ۸۰

(۳) ۴۸: الفتح: ۱۰

(۴) اس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ شمار کیا تاکہ "ید اللہ فوق ایدیھم" کا قانون نافذ رہے

(۵) ۸: الانفال: ۱۷

پڑھ کر ایک مشت خاک پھینکی تمام کافر اپنی آنکھیں ملنے لگے اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔ یعنی ظاہر میں رمی اگرچہ آپ کے ہاتھ سے تھی لیکن در حقیقت وہ اللہ کے ہاتھ سے تھی کیونکہ بشر میں یہ طاقت نہیں کہ ایک مشت خاک سے ایک عظیم لشکر کی آنکھوں کو خیرہ بنادے اور ہر سپاہی کی آنکھ میں اس خاک کو پہنچا دے یہ سب اللہ کی قوت اور طاقت تھی، آپ کی قوت اور طاقت نہ تھی البتہ آپ کا ہاتھ اللہ کی قوت وطاقت کا مظہر اور تجلی گاہ تھا[1]۔

گفت یزداں مارمیت اذ رمیت　　　　تو ز قرآن باز خواں تفسیر بیت

ماکمان و تیر اندازش خداست　　　　گر بپرانیم تیراں نے زماست[2]

جس طرح ٹیلیفون خود نہیں بولتا بولنے والا پس پردہ کوئی اور ہوتا ہے اسی طرح نبی کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ در حقیقت اللہ کی آواز ہوتی ہے۔

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود[3]　　　　گفتہ او گفتہ اللہ بود

---

(۱) سنہ ۲ھ میں حق و باطل کے اولین معرکہ میں نبی کریم ﷺ نے عین حالت جنگ میں تین مرتبہ شاہت الوجوہ کہہ کہ ایک مٹھی سنگریزے قریش کی طرف پھینکے اور صحابہ کو حملہ کا حکم دیا کفار کے ایک ہزار کے لشکر میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس سے متاثر نہ ہوا ہو ایسے حیران اور پریشان ہوئے کہ میدان سے ان کے قدم اکھڑ گئے ایک مشت خاک میں یہ اثر اللہ ہی کا پیدا کردہ تھا اس کی جانب اس ایت مبارکہ میں اشارہ ہے۔

(۲) اس شعر کا ترجمہ قرآن سے سیکھ، اللہ نے فرمایا کہ آپ ﷺ نے نہیں پھینکے جب آپ ﷺ نے پھینکے تھے، اگر ہم نے تیر پیوست کیے ہیں تو وہ ہماری طرف سے نہیں ہیں بلکہ ہم تو صرف کمان ہیں، تیر انداز اللہ تعالیٰ ہیں

(۳) آپ ﷺ کی گفتگو، اللہ کی گفتگو ہوتی اگرچہ بظاہر وہ اللہ کے بندے (نبی کریم ﷺ) کی زبان مبارک سے ہو رہی ہوتی ہے۔

دلیل ۶:
عصمت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

قال تعالیٰ والنجم اذا ھویٰ ماضل صاحبکم و ماغویٰ و ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ(۱)۔

(قسم ہے ستارہ کی جب وہ گرے تمہارا ساتھی یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ بہکا اور نہ بے راہ چلا اور نہ وہ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتا ہے اس کا اشارہ نری وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے)۔

یعنی جس طرح ستارہ اپنی ایک معین رفتار پر چلتا ہے ذرہ برابر ادھر یا ادھر نہیں ہو پاتا اسی طرح نبی اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان نبوت و رسالت کے ایک ستارے ہیں جو راہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقرر فرمادی ہے اس سے ذرہ برابر آگے پیچھے نہیں ہوسکتے۔ اور جس طرح ظاہری ستاروں کا نظام محکم ہے اسی طرح بلکہ زائد باطنی اور روحانی ستاروں کا نظام محکم ہے جس میں ذرہ برابر تزلزل اور اختلاف کا امکان ہی نہیں ظاہری ستارں سے ظاہری راستوں کی ہدایت وابستہ ہے اور باطنی ستاروں سے باطنی اور روحانی راستوں کی ہدایت وابستہ ہے۔

---

(۱) ۵۳: النجم: ۱ تا ۴: محمد اسلم جیراج پوری اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس آیت میں دعویٰ قرآن کے اللہ کی وحی ہونے کا کیا جارہا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پر نطق وگویائی کا نہیں جیراج پوری یہ موقف اس لحاظ سے بھی درست نہیں کہ نطق کا لفظ لغوی اعتبار سے اس کی گنجائش نہیں رکھتا، دوسرے یہ کہ نطق کا لفظ قرآن کریم میں گیارہ مرتبہ استعمال ہوا ہے اور کسی بھی جگہ کسی کتاب یا تحریر پڑھنے کے لیے استعمال نہیں ہوا بلکہ گفتگو اور عام بول چال کے لیے ہی استعمال ہوا ہے۔

(ف) اس آیت میں ضلال اور غوایت دونوں کی نفی فرمائی۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ضلال۔ علم کی گمراہی کو کہتے ہیں اور غوایت عملی گمراہی کو لہذا معنی یہ ہوں گے کہ حضور ﷺ کے نہ علم میں غلطی ہے اور نہ عمل میں۔ بعض علماء نے اس طرح فرق کیا کہ ضلال وہ ہے کہ جو خطاً ہو اور غوایت وہ ہے جو عمداً ہو بعض نے یہ کہا کہ ضلال کے معنی حق اور صحیح راستہ سے ہٹ جانے کے ہیں اور غوایت کے معنی باطل راستہ پر چلنے کے ہیں۔ کما قال تعالیٰ:

وان یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلاً و ان یروا سبیل الغی یتخذوہ سبیلاً[۱]. (اور اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس پر نہیں چلتے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس پر چلنے لگتے ہیں)۔

اور اس وحی میں سے متلو کو قرآن اور وحی غیر متلو کو حدیث کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نبی کا خواب بھی حجت ہوتا ہے اگر نبی کا خواب حجت نہ ہوتا تو ابراہیم خلیل اللہ کا محض خواب کی بنا پر اپنے بیٹے کو ذبح کرنا جائز نہ ہوتا جس کا مفصل قصہ قرآن کریم میں مذکور ہے[۲] حضرت یوسف علیہ السلام کا تمام قصہ ایک خواب ہی کی تعبیر تھا[۳]۔

---

(۱) ۷: الاعراف: ۱۴۶

(۲) سورۃ صٰفٰت میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے خواب میں دیکھا اور پھر دونوں باپ بیٹا اس پر عمل کے لیے تیار ہوگئے کہ یہ حکم الٰہی تھا۔ دیکھیے الصّٰفّٰت: ۱۰۲ تا ۱۰۷۔

(۳) اشارہ ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی جانب جس میں آپ ﷺ نے چاند سورج اور گیارہ ستاروں کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ دیکھیے ۱۲: یوسف: ۴

دلیل : ۷

مقام انبیاء علیھم السلام

قرآن کریم کی نصوص، عبارات اور اشارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہ السلام کا درجہ۔ ملائکۃ اللہ سے بلند اور برتر ہے ملائکہ کرام باوجودیکہ ان کے حق میں یہ ارشاد باری ہے۔ عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون[1] اور لایعصون اللّٰہ ما امرھم و یفعلون مایؤمرون[2] لیکن بایں ہمہ حق جل شانہ نے اپنی خلافت و دیانت کا منصب جلیل حضرت آدم علیہ السلام کو عطا فرمایا اور مسجود ملائک بنایا اور فرشتوں کی تسبیح و تقدیس کے مقابلہ میں ان کا علم میں فائق اور برتر ہونا ظاہر فرمایا اور جس ابلیس لعین نے ان کی افضلیت اور برتری کے مقابلہ میں۔ اناخیر منہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین[3] اور ھذا الذی کرمت علیّ[4] کا لفظ زبان سے نکالا اس کو بیک وقت و دو گوش ہمیشہ کے لیے بارگاہ قدس سے نکال باہر کیا۔

غرض یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے سر پر تاج خلافت رکھا اور ملائکہ کرام جن کو حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں جابجا اپنا لشکر اور اپنی فوج فرمایا کما قال تعالیٰ ومایعلم جنود ربک الا ھو[5] ان کو اپنے انبیاء اور

---

(۱) ۲۱: الانبیاء : ۲۷

(۲) ۶۶: التحریم: ۶

(۳) ۷: الاعراف : ۱۲

(۴) ۱۷: الاسراء : ۶۲

(۵) ۷۴: المدثر: ۳۱

خلفاء کا ممد اور معاون بنایا اور جب کبھی حضرات انبیاء کا اعداء اللہ سے مقابلہ ہوا تو اللہ کے لشکر یعنی فرشتوں نے انبیاء کرام کی تائید اور امداد کی اور اعداء اللہ کو تہ و بالا اور زیرو زبر کیا۔ اور فرشتوں نے انبیاء کے جھنڈے نیچے ہو کر کفار کا مقابلہ اور ان سے مقاتلہ کیا جیسا کہ جنگ بدر میں پیش آیا۔ غرض یہ کہ قرآن کریم کی بے شمار نصوص سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی سیادت (قیادت) اور ملائکہ مکرمین کی تابعیت [1] روز روشن کی طرح ظاہر ہے اسی وجہ سے اہل سنت والجماعت کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام ملائکۃ اللہ سے افضل ہیں کمال قال تعالیٰ:

ان اللّٰه اصطفیٰ آدم ونوحاً وآل ابراہیم وآل عمران علی العلمین[2].
(تحقیق اللہ تعالیٰ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں پر فضیلت دی)۔

وقال تعالیٰ: وتلک حجتنا آتیناها ابراهیم علی قومه نرفع درجات من نشاء ان ربک حکیم علیم ووهبناله اسحاق و یعقوب. کلا هدینا ونوحا هدینا من قبل. و من ذریته داؤد وسلیمان و ایوب و یوسف و موسیٰ و هارون و کذالک نجزی المحسنین وزکریا و یحیٰی وعیسیٰ والیاس کل من الصالحین . واسماعیل والیسع ویونس ولوطا [3].

حق تعالیٰ شانہ نے ان آیات میں انبیاء کرام علیہم السلام کا نام بنام تذکرہ فرمایا اور اس کے بعد فرماتے ہیں: وکلا فضلنا علی العالمین [4] اور ہر

---

(۱) تابعیت: نیابت، معاونت، مدد
(۲) ۳: آل عمران: ۳۳
(۳) ۶: الانعام: ۸۳ تا ۸۶
(۴) ایضاً: ۸۶

ایک کو ہم نے تمام جہانوں پر فضیلت اور بزرگی دی اور ظاہر ہے کہ عالمین میں فرشتے بھی داخل ہیں معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہ السلام فرشتوں سے بھی افضل ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام۔ ملائکہ کرام سے افضل اور برتر ہیں اور ملائکہ کے کلام اور وحی اور الہام کے حجت ہونے میں شیطان کو بھی شبہ اور تردد نہیں تو انبیاء کرام کے قول و فعل کے حجت اور واجب العمل ہونے میں بھی کوئی شبہ اور تردد نہ ہونا چاہئیے۔

دلیل : ۸

نبی کا عمل۔ منہاج و شریعت

قال تعالیٰ: لکلّ جعلنا منکم شرعة و منهاجا[۱].

واتبع ملة ابراهیم[۲].

(ہر ایک کو ہم نے ایک شریعت اور ایک طریق دیا ہے) (آپ ملت ابراہیمی کا اتباع کیجئیے)۔

ثم جعلناک علی شریعة من الامر فاتبعها ولا تتبع اهوآء الذین لا یعلمون[۳].

(ہم نے آپ کو ایک شریعت پر کردیا ہے پس آپ اسی کا اتباع کیجئیے اور نادانوں کی خواہشوں پر نہ چلنا)۔

---

(۱) ۵: المائدہ: ۴۸

(۲) ۱۶: النحل: ۱۲۳

(۳) ۴۵: الجاثیہ: ۱۸

یہ منہاج، شریعت اور لفظ ملت جس کا ذکر قرآن کریم میں بار بار آیا ہے، یہ تمام کتاب اللہ اور صحیفہ خداوندی سے سوا ہیں۔ منہاج اور شریعت صرف نبی کے اقوال و افعال اور اس کے تکلم اور سکوت[۱] کے مجموعہ کا نام ہے جس پر گامزن ہونا قرآن کریم نے فرض اور لازم قرار دیا ہے۔

دلیل: ۹
نبی کریم ﷺ کی زندگی۔ اسوہ کاملہ

لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللّٰہ والیوم الاخر وذکر اللّٰہ کثیر[۲]۔

(تحقیق تمہارے لیے رسول کی ذات میں عمدہ نمونہ ہے یعنی جو شخص اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہوا اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرتا ہے اس کے لیے آپ نمونہ ہیں)۔

اس آیت میں حضور ﷺ کی ذات با برکات کو اسوہ حسنہ یعنی بہترین نمونہ قرار دیا ہے کہ یہ اللہ کی اطاعت کا نمونہ ہیں، ان کو دیکھ کر اللہ کی اطاعت کرو اور ہر قول و فعل اور ہر حرکت و سکون میں ان کا اتباع کرو[۳]۔

---

(۱) تکلم اور سکوت: گفتگو اور خاموشی

(۲) ۳۳: الاحزاب: ۲۱

(۳) امام راغب اصفہانی اسوۃ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسوۃ انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے کی اتباع اور پیروی میں وہ اختیار کرتا ہے خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری۔ یعنی نبی کریم ﷺ کی زندگی اللہ کی اتباع اور پیروی کی عملی تصویر اور کیفیت ہے۔

جاننا چاہئیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کو فقط اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ فقط بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچا کر اپنی منصبی خدمت سے فارغ ہوجائیں بلکہ وہ من جانب اللہ۔ امت کے لیے معلم، ہادی، مصلح اور مربی بلکہ اسوہ حسنہ بنا کر بھیجے گئے ہیں تاکہ ان کا ہر قول، ہر فعل اور ان کا ہر بیان اور سکوت امت کے لیے حجت اور مشعل ہدایت ہو اور اللہ کے بندوں کو معلوم ہوجائے کہ خدا کی اطاعت اس طرح کرو جس طرح نبی کو کرتے دیکھا[1]۔

دلیل: ۱۰

مقاصد نبوت

لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ و ان کانوا من قبل لفی ضلال مبین[2].

(تحقیق اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر ایک عظیم احسان فرمایا کہ ان میں سے ایک عظیم الشان رسول بھیجا جو ان پر آللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کو کفر اور معصیت کے میل سے پاک اور صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب

---

(۱) علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ اس آیت کا شان نزول غزوہ احزاب میں تقسیم غنیمت کا موقع ہے لیکن یہ حکم اس واقعہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ حکم عام ہے زندگی کے ہر شعبہ اور مرحلہ میں ہمارے لیے نبی کریم کی تعلیمات اور آپ کی طریقوں کی پیروی ہمارے لیے ضروری ہے۔ دیکھئیے ابن کثیر۔ تفسیر، ج ۳: ص ۴۷۴

(۲) ۳: آل عمران: ۱۶۴

اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تحقیق لوگ اس رسول کی آمد سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے)۔

اس آیت میں حق جل شانہ نے بعثت نبوی کے مقاصد کو بیان فرمایا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) تلاوت آیات یعنی آیتوں کو پڑھ کر سنانا

(۲) تزکیہ اخلاق و اعمال یعنی امت کے ظاہری اور باطنی امراض کا معالجہ اور اصلاح۔

(۳) تعلیم کتاب اللہ۔ یعنی کتاب اللہ کے معانی کو سمجھانا۔ اور ظاہر ہے کہ اس تعلیم کے لیے فقط تلاوت آیات کافی نہیں۔ تلاوت اور شئی ہے تعلیم اور شئی ہے تلاوت کے معنی محض الفاظ سنادینے کے ہیں اور تعلیم کے معنی معانی اور مفاہیم کے سمجھانے کے ہیں۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ ہدایت و رشد کے لیے فقط کتاب کا نازل کردینا کافی نہیں بلکہ تعلیم و تربیت کے لیے حضرات انبیاء کی بعثت بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ تعلیم کے لیے فقط کتاب کافی نہیں بلکہ عملی نمونہ بھی ضروری ہے اس کی واضح مثال خوش نویسی کی کتاب ہے کہ محض اس کو دیکھ کر خوش نویس نہیں بن سکتا جب تک کہ ماہر کتابت استاذ اس کو کتابت نہ سکھائے کبھی زبان سے ب اور ج کا قاعدہ بتلائے گا اور کبھی خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر دکھلائے گا کہ اس طرح لکھو[1] اور کبھی شاگرد استاذ کے سامنے حروف لکھ کر دکھائے گا اور استاذ ان کو پاس کرے گا شاگردوں کے حروف پر استاذ کا سکوت کرجانا اور یہ نہ کہنا کہ تم نے یہ حروف غلط اور خلاف قاعدہ لکھے اسی کا

---

(۱) ہذا کما ورد فی الحدیث صلوا کما رأیتمونی۔ مؤلف

نام پاس کرنا ہے۔اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی امر کو دیکھ کر منع نہ کرنا اسی کا نام شریعت میں تقریر نبوی ہے خلاصہ یہ کہ تعلیم اور تربیت کے تین طریقے ہیں قول، فعل اور تقریر[۱] اور پھر کسی کی تعلیم کسی طریقہ سے ہوتی ہے اور کسی کی کسی اور طریقہ سے، ظاہر ہے کہ تعلیم اور تزکیہ کے طریقے قرآن کریم میں منصوص نہیں، نبی اور رسول ہی کی تلقین سے معلوم ہوں گے اور ان سب کو حدیث ہی کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ نبی کی حیثیت فقط قاصد اور ڈاکیہ کی سی نہیں کہ فقط اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچا دیا اور پھر اس کو خدا کے بندوں سے کسی خطاب کا حق باقی نہیں رہا۔ حاشا و کلا ہرگز ہرگز ایسا نہیں بلکہ اس کی حیثیت معلم اور مربی کی ہے۔

نیز یہی آیت سورہ بقرہ میں اس طرح ہے کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلو علیکم آیاتنا و یزکیکم و یعلمکم الکتاب والحکمۃ و یعلمکم مالم تکونوا تعلمون[۲]. (اسی طرح ہم نے تم میں سے ایک رسول تم میں بھیجا جو تمہارے سامنے ہماری آیات تلاوت کرے، تمہارے اخلاق پاک صاف کرے، تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور تمہیں وہ کچھ سکھائے جو تم نہیں جانتے) اس آیت میں "ویعلمکم ما لم تکونوا

---

(۱) قول، فعل اور تقریر حدیث کے تین مصداقات ہیں قول سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ فرمایا، فعل سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ کر کے دکھایا اور تقریر کے معنی یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں یہ بات آئی کہ فلاں صحابی نے یہ کہا ہے یا یہ کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو منع نہیں فرمایا، آپ کا منع نہ فرمانا اس کے جائز ہونے کی دلیل ہے۔

(۲) ۲:البقرہ:۱۵۱

(۳) شافعی، محمد بن ادریس، الرسالہ،

تعلمون" کا اضافہ ہے یعنی وہ نبی تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا اور وہ نبی اپنے قول، عمل، سکوت اور تقریر سے تم کو وہ علوم و معارف سکھائے گا جن کو تم بالکل نہیں جانتے تھے اور جو بات نبی کی تعلیم و تلقین سے معلوم ہو، اسی کو حدیث اور سنت کہتے ہیں۔ امام شافعیؒ اپنے رسالہ میں فرماتے ہیں کہ میں نے تمام علماء قرآن کو یہ کہتے سنا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں کتاب اللہ کے بعد حکمت کا لفظ آیا ہے سب جگہ حکمت سے سنت نبوی مراد ہے[1]۔ قال تعالیٰ:

واذکرن ما یتلے فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ واذکروا نعمت اللہ علیکم و ما انزل علیکم من الکتاب والحکمۃ یعظکم بہ[2].

وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ و علمک مالم تکن تعلم و کان فضل اللہ علیک عظیماً[3].

(اور یاد کرو ان آیات اور حکمت اور دانائی کی باتوں کو جن کو تمہارے گھروں میں پڑھا جاتا ہے)۔ (اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کے احسان کو اور اس بات کو کہ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری اسی کی تم کو نصیحت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی اور آپ کو وہ چیزیں سکھائیں کہ جو آپ کو معلوم نہ تھیں اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہے)۔

حکمت کے اصل معنی دانائی کے ہیں جس کا اولین مصداق قول

---

(۱) ۳۳: الاحزاب: ۳۴

(۲) ۲: البقرۃ: ۲۳۱

(۳) ۴: النساء: ۱۱۳

رسول ﷺ ہے اور جو شخص حدیث نبوی اور قول رسول ﷺ کو حکمت اور دانائی سے خارج سمجھے، یہی اس کے نادان اور بے عقل ہونے کی صریح دلیل ہے۔

دلیل: ۱۱

مقصد نزول قرآن

قال تعالیٰ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون

(ہم نے آپ پر اس لیے قرآن اتارا تاکہ آپ لوگوں کے لیے اس کتاب کے معانی بیان فرمائیں کہ جو ان کی ہدایت کے لیے اتاری گئی۔ اور تاکہ اس کے بعد لوگ اس میں غور و فکر کریں)۔

یعنی یہ کتاب حکیم جو آپ پر اتاری گئی ہے وہ تمام انبیاء کرام کے صحیفوں کی اجمالی یاد داشت ہے۔ جس میں تمام کتب الہیہ کے علوم نہایت ایجاز اور اعجاز[۲] کے ساتھ بھرے ہوئے ہیں ہر کس و ناکس کی ان علوم تک رسائی نہ ہوگی۔

اس ذکر حکیم کے مشکلات کی شرح اور مجملات کی تفسیر آپ کے ذمہ ہے۔ لہذا آپ اس کتاب کے مضامین کو واضح فرمائیں۔ اور آپ کی

---

(۱) ۱۶: النحل: ۴۴

(۲) قاضی عیاض کے بقول قرآن کریم کے حسن تالیف، کلمات و آیات کے باہمی ارتباط و تناسب، معیار فصاحت و بلاغت، نظم و طرز کلام، انداز بیان، اقوام سابقہ کے واقعات اور غیب کی خبروں کی وجہ سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، اسی کو اعجاز قرآن کہا جاتا ہے۔ دیکھیے قاضی عیاض، الشفا

توضیح و تشریح کے بعد بھی اس میں اتنے حقائق و دقائق باقی رہیں گے۔ کہ ان تک پہنچنے کے لیے غور و فکر کی ضرورت ہو گی جن کا عقدہ حضرات صحابہؓ و تابعین اور ائمہ مجتہدینؒ کے ناخن فکر سے کھلے گا۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے فقط زبان دانی کافی نہ ہو گی یہ علم اور فن ہی جدا ہے۔ جس طرح محض زبان داں ہونے سے طب اور ڈاکٹر کی کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتا جب تک طبیب اور ڈاکٹر اس کا مطلب نہ سمجھائے۔ اسی طرح اس طب روحانی یعنی قرآن کریم کو بغیر طبیب روحانی یعنی نبی اکرم ﷺ کے بیان اور تفسیر کے نہیں سمجھ سکتا۔ اور جس طرح محض زبان داں کا خود فہمیدہ مطلب معتبر نہیں، اسی طرح اس طب روحانی (قرآن کریم) کا بھی خود فہمیدہ اور خود تراشیدہ مطلب معتبر نہ ہو گا بلکہ طبیب روحانی یعنی نبی اکرم ﷺ ہی کا بیان فرمودہ مطلب معتبر ہو گا اور جو مطلب طبیب روحانی اور اس کے شاگردوں (یعنی صحابہ کرامؓ) کی تشریحات کے خلاف ہو گا وہ ذرہ برابر بھی قابل التفات نہ ہو گا۔ منکرین حدیث کا مقصد یہ ہے کہ جس طبیب روحانی (نبی اکرم ﷺ) پر جس طب روحانی (قرآن کریم) کا نزول ہوا اور جس ذات بابرکات پر خدا کا فرشتہ طب روحانی کا صحیفہ لے کر اترا اس طب روحانی کے متعلق اس طبیب روحانی کی کوئی شرح اور تفسیر حجت اور معتبر نہیں۔ اور بیماری لولی، لنگڑی اور لنجی عقل جو روحانی حیثیت سے سل، دق، جذام، مالیخولیا اور سرسام میں مبتلا ہے۔ وہ آیات قرآنیہ کا جو الٹا سلٹا مطلب بیان کر دے وہ سب معتبر اور مستند ہے۔ گویا کہ یہ اغبیاء لئام، وحی خداوندی کا مطلب حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ سوا گر

نبی کریم علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ کی تفسیر اور بیان فرمودہ مطلب معتبر اور حجت نہیں تو آپ (منکرین) کا بیان کردہ مطلب کیسے معتبر اور حجت ہوسکتا ہے۔ جبکہ آپ عربی زبان بھی اچھی طرح نہیں جانتے۔ حق تو یہ ہے کہ حدیث نبوی اور اقوال صحابہ کے بغیر قرآن کا مطلب سمجھنا ہے ممکن نہیں امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد ہے۔

لولا السنة مافهم احد منا القرآن[1]. اگر حدیث نہ ہوتی تو ہم میں سے کوئی بھی قرآن کو نہ سمجھتا

بغیر احادیث اور اقوال صحابہ کے نہ نماز، نہ زورہ، نہ حج، نہ زکوٰۃ، نہ خلع، نہ طلاق، اور نہ جہاد و قتال اور نہ اعداء اللہ سے صلح و جنگ کسی شئی کی بھی حقیقت منکشف نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم میں عقائد، اخلاق، عبادات، معاملات اور سیاست ملکیہ اور مدنیہ سب ہی کا ذکر ہے لیکن کیا ان تمام امور کا عقدہ بغیر احادیث نبویہ اور اقوال صحابہؓ کے حل ہوسکتا ہے؟ اور کیا مال غنیمت اور ارض مفتوحہ کے متعلق جو احکام قرآن کریم میں مذکور ہیں، ان کی حقیقت بدون[2] فاروق اعظمؓ کی رہنمائی کے منکشف ہوسکتی ہے؟ حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کے ہاتھوں سے قیصر و کسریٰ کے خزائن تقسیم کرائے تاکہ قیامت تک کے آنے والے مسلمانوں کو واعلموا انما غنمتم من شئی فان للہ خمسه[3] کی تفسیر معلوم ہو۔

---

(۱) عثمانی، ظفر احمد مولانا، اعلاء السنن، کراچی، ادارۃ القرآن مقدمہ ۳، ص ۴۹

(۲) بدون: بغیر

(۳) ۸: الانفال: ۴۱۔ ترجمہ "اور جان لو کہ جو تم کو کچھ مال غنیمت ملے تو اس میں سے پانچواں حصہ خدا تعالیٰ کا ہے"

پس جس طرح نبی اکرم ﷺ کے اقوال و افعال قرآن کریم کی تفسیر ہیں۔ اسی طرح درجہ ثانیہ میں حضرات صحابہؓ کے اقوال و افعال بھی قرآن کریم اور حدیث نبوی کی تفسیر اور شرح ہیں۔ بغیر ان کی رہنمائی کے قرآن کا مطلب حل نہیں ہوسکتا۔ صدہا روایات سے صحابہ کرامؓ کا آنحضرت ﷺ سے آیات قرآنیہ کے متعلق سوالات کرنا اور حضور ﷺ کاجوابات دینا ثابت ہے[1]۔ یہ ذخیرہ علم و حکمت کا ایک عجیب خزینہ اور گنجینہ ہے۔ اور علیٰ ہذا ہزار ہا روایات سے آیات کے اسباب نزول کا علم ہوتا ہے، جس سے عجیب وغریب حقائق و معارف کا انکشاف ہوتا ہے۔ منکرین حدیث اگرچہ اس تمام ذخیرہ کو جو اسانید مسلسلہ اور روایات متواترہ سے ثابت ہے۔ موضوعات کا دفتر بتلادیں۔ لیکن ادنیٰ عقل والا اس گنجینہ علم و حکمت سے قطع نظر نہیں کرسکتا۔

طریقۂ امتحان

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ بغیر حدیث نبوی اور بغیر اقوال صحابہؓ کے قرآن کریم کی تفسیر ممکن ہے تو وہ تفسیر کرکے دکھلائے۔ طریقہ امتحان یہ ہے کہ کسی عبادت، معاملہ یا سیاست ملکیہ و مدنیہ کے متعلق آیات قرآنیہ سے چند سوالات مرتب کئے جائیں اور منکر حدیث کو فقط قرآن کریم دے کر ایک بند کمرہ میں بٹھلادیا جائے کہ اس سوال کا جواب

---

(۱) عہد صحابہ کے تفسیری ماخذ میں قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے اولین ماخذ قرآن کریم خود اور نبی کریم ﷺ کی ہدایات و تعلیمات تھیں۔ دیکھیے ذہبی، التفسیر والمفسرون۔ ج۱: ص ۳۷

فقط قرآن سے دو۔ کسی حدیث اور کسی صحابی کے قول کا اس میں شائبہ بھی نہ آنے پائے۔ اور اس کمرہ میں سوائے قرآن کریم کے حدیث اور تفسیر کی کوئی کتاب نہ ہو کہ جس سے استفادہ کرکے جواب لکھیں ورنہ در حقیقت جواب تو ہوگا مفسرین کا اور نام ہوگا ان کا۔ اور دوسرا شخص اسی سوال کا جواب حدیث نبوی اور اقوال صحابہؓ کی روشنی میں لکھے اور پھر دونوں جوابوں کا موازنہ کیا جائے۔ انشاء اللہ اس وقت منکرین حدیث کی قرآن دانی اور قرآن فہمی کی حقیقت واضح ہوجائے گی۔ اور اگر آیت کریمہ کے صیغے [۱] اور اعراب [۲] کے متعلق بھی کچھ سوال کرلیا جائے تو اور بھی حقیقت واضح ہوجائیگی۔ فقط قرآن سے اپنا جدید علم کلام [۳] جدید فقہ، جدید اصول فقہ اور جدید علم اخلاق پیش کریں۔

منکرین حدیث دین اسلام کا نقشہ پیش کریں

منکرین حدیث کو چاہئیے کہ فقط قرآن کریم سے دین اسلام کے عقائد اور اعمال، حلال و حرام، احکام معاملات و احکام معاشرت اور احکام

---

(۱) صیغے: الفاظ

(۲) اعراب: قواعد عربیہ کے لحاظ کسی اسم کے آخری حرف پر زیر زبر، پیش کو اعراب کہتے ہیں۔ یعنی ان منکرین حدیث سے فعل میں پائی جانے والی تبدیلیاں معلوم کرلو یا اسم کی مختلف اعرابی حالتیں دریافت کرلو، حقیقت خود بخود کھل کر سامنے آجائے گی۔

(۳) علم الکلام اسلام کے دینی علوم میں سے ایک علم ہے جس کا مقصد عقائد دینیہ کو دلائل عقلیہ کے ذریعہ پایہ ثبوت کو پہنچانا اس کے مختلف مسالک ہیں جنہیں جبریہ و قدریہ، مرجئہ، معتزلہ، اشاعرہ، ماتریدیہ اور متکلمین اہل سنت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جہاد و احکام خراج[1] و جزیہ[2] کا مسلمانوں کے سامنے نقشہ پیش کریں اور پھر اس نقشہ کا علماء امت کے پیش کردہ نقشہ سے موازنہ کیا جائے منکرین حدیث اپنا نقشہ فقط قرآن سے مرتب کریں۔ حدیث نبوی اور اقوال صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین سے کسی قسم کا سرقہ نہ کریں۔ تب دنیا کو اس گروہ کا مبلغ علم و مبلغ فہم معلوم ہوجائے گا۔ منکرین حدیث علم فقہ میں قدوری، اصول الشاشی جیسی کتب لکھ کر تو دکھلائیں تاکہ آپ کے علم کا سلف کے علم و فہم کے ساتھ موازنہ ہوسکے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ انگریزی قانون کو وہی سمجھ سکتا ہے جو انگریزی زبان اور اس کے قواعد صرفیہ و نحویہ اور بلاغت سے بخوبی واقف ہو۔ بلا تشبیہہ اسی طرح قانون خداوندی یعنی قرآن کریم کا مطلب اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک لغت، صرف، نحو اور بلاغت میں مہارت نہ ہو۔ حال تو یہ ہو کہ کافیہ[3] اور شافیہ[4] کی خبر نہ ہو اور سیبویہ[5] اور فراء[6] سے ہمسری کا دعویٰ ہو۔

---

(۱) خراج: وہ لگان (زرعی ٹیکس) جو دارالاسلام میں غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے۔

(۲) جزیہ: اسلامی حکومت کا وہ ٹیکس جو وہ ذمیوں (غیر مسلم اقلیتوں) سے جو حدود سلطنت میں آباد ہوں، ان کی جان اور مال کی حفاظت کی ذمہ داری پر لیا جاتا ہے۔

(۳) کافیہ: علم نحو کی بنیادی کتاب

(۴) شافیہ: علم صرف کی بنیادی کتاب

(۵) سیبویہ: ابو بشر عمرو بن عثمان: م ۱۷۷ھ

(۶) فراء: ابوزکریا یحییٰ بن زیاد: م ۲۰۷ھ معرف نحوی

دلیل : ۱۲

نبی کریم ﷺ کے فیصلے

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ[1].

(تحقیق ہم نے آپ پر کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے درمیان میں اس طرح فیصلہ کریں جس طرح اللہ آپ کو دکھلائے اور سمجھائے)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ اپنی نور بصیرت سے دیکھ کر فیصلہ کریں۔ سر کی آنکھ سے دیکھنے کا نام رویت بصری ہے اور دل کی آنکھ سے دیکھنے کا نام رای قلب ہے۔ جس کو بما آراک اللہ سے تعبیر فرمایا اور یہ ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ نزاعات اور اختلافات کا جو فیصلہ فرماتے تھے اس میں فقط آیات قرآنیہ نہیں پڑھ دیتے تھے بلکہ خدا داد رائے سے اپنے الفاظ میں اس کا فیصلہ فرماتے تھے اور اسی کا نام حدیث اور سنت ہے۔

دلیل : ۱۳

اطاعت رسول ﷺ پر محبت الٰہی کا حصول

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم[2].

---

(۱) ۴: النساء: ۱۰۵ (۲) ۳: آل عمران: ۳۱

اس آیت مبارکہ میں یہ بات واضح کی جارہی ہے کہ انسان اپنے خالق کی محبت اپنے دل میں پیدا کرنا چاہتا ہے اسے اپنے عمل سے ثابت کرنا چاہتا ہے، یا خالق کی محبت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو اسے نبی کریم ﷺ کے طریقہ زندگی کو اپنانا اور آپ کی پیروی کرنی ہوگی۔

(آپ لوگوں سے کہہ دیجئیے کہ اگر تم حق تعالیٰ کو محبوب رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم کو میرے اتباع کی وجہ سے محبوب رکھے گا اور اسی وجہ سے تمہارے گناہوں کی مغفرت کرے گا)۔

اس آیت میں اللہ کی محبت کا معیار اور گناہوں کی مغفرت کا دارو مدار حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع کو قرار دیا اور یہ نہیں فرمایا فاتبعوا القرآن یعنی اگر تم اللہ کو محبوب رکھتے ہو تو قرآن کا اتباع کرو۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات با برکات کا اتباع واجب ہوا تو تمام اقوال کا اتباع خود اس میں داخل ہو گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال ہی کا نام حدیث اور سنت ہے۔

دلیل : ۱۴

کمالات و اوصاف نبوت

قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرام کی جن صفات جلیلہ کا ذکر کیا ہے ہم ان کو نہایت اختصار کے ساتھ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جس سے حضرات انبیاء کرام کے اقوال و افعال اور حرکات و سکنات کا حجت اور مشعل ہدایت ہونا روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گا۔

۱۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اللہ جل جلالہ کے مصطفیٰ اور مجتبیٰ، پسندیدہ اور برگزیدہ بندے ہیں۔ تمام کائنات کا انتخاب اور تمام جہانوں کا خلاصہ اور لب لباب ہیں۔

سلام علی عبادہ الذین اصطفی[1].

---

(1) ۲۷: النمل: ۵۹

۲۔ حضرات انبیاء اللہ عزوجل کے ایسے خالص اور مخلص بندے ہیں کہ شیطان بھی ان کے اغوا[1] سے قطعاً نا امید ہے۔

قال رب بما اغویتنی لازینن لهم فی الارض ولاغوینهم اجمعین الا عبادک منهم المخلصین[2].

(شیطان بولا۔ اے رب جیسا تو نے مجھ کو راہ سے بہکایا اسی طرح میں بھی بنی آدم کے لیے دنیا کی نفسانی خواہشات کو خوب مزین کرکے ان کے سامنے پیش کروں گا۔ اور سیدھی راہ سے ان کو بہکاؤں گا۔ مگر تیرے عباد مخلصین یعنی جو تیرے منتخب اور چیدہ اور برگزیدہ بندے ہیں ان کا کچھ نہیں کرسکوں گا)۔

"مخلص" لام کے فتح اور کسرہ کے ساتھ[3] وہ شخص ہے کہ جو مادہ شیطانی اور مادہ نفسانی سے پاک ہو اور ظاہر ہے کہ یہی مادہ شیطانی اور مادہ نفسانی[4] منشاء معصیت اور سرچشمہ صغیرہ و کبیرہ ہے۔ اور جب حضرات انبیاء مادہ معصیت ہی سے پاک ہوئے تو عصمت اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ یوسف علیہ السلام کے قصہ میں فرماتے ہیں۔

کذ لک لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصین[5].

(دیکھ لو اس طرح سے ہم یوسف سے برائی اور بے حیائی کو پھیرتے اور

---

(۱) اغواء: بہکانے، راہ سے بھٹکانے

(۲) ۱۵: الحجر: ۳۹

(۳) (لام کے فتح اور کسرہ کے ساتھ): لام کے زبر اور زیر کے ساتھ۔

(۴) مادہ شیطانی سے گناہ کا بیرونی محرک اور مادہ نفسانی گناہ کا اندرونی محرک یا اس بیرونی محرک کو قبول کرنے کی صلاحیت و قوت مراد ہے۔

(۵) ۱۲: یوسف: ۲۴

مٹاتے ہیں۔ اور کیوں نہیں تحقیق یوسف ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے)۔

سوء سے گناہ صغیرہ اور فحشاء سے گناہ کبیرہ مراد ہے یعنی چونکہ یوسف علیہ السلام اللہ کے مخلص بندوں میں سے تھے۔ اس لیے کسی قسم کا سوء اور فحشاء یعنی صغیرہ اور کبیرہ ان تک نہ پہنچ سکا۔ حق جل شانہ نے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے یوسف کو سوء اور فحشاء سے مٹایا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ سوء اور فحشاء کو یوسف سے پھیرا اور ہٹایا۔ غرض یہ کہ لنصرف کا مفعول بہ یوسف علیہ السلام کو نہیں بنایا بلکہ لنصرف کا مفعول سوء اور فحشاء کو بنایا، اشارہ اس طرف ہے کہ یوسف صدیق اپنے مقام صدیقیت پر قائم تھے۔ انہوں نے ذرہ برابر کوئی حرکت سوء اور فحشاء صغیرہ اور کبیرہ کی طرف نہیں فرمائی کہ جو ان کو ہٹایا جاتا بلکہ سوء اور فحشاء نے یوسف صدیق کو طہارت ماب اور نزاہت جناب بارگاہ کی جانب حرکت کرنا چاہی۔ من جانب اللہ سوء اور فحشاء کو ہٹا دیا گیا۔ اور دھکے دے دیئے گئے تاکہ خدا کے مخلص بندے تک پہنچنے ہی نہ پائے اور ان کی پاک و صاف عصمت و نزاہت پر کسی سوء اور فحشاء صغیرہ اور کبیرہ کا دھبہ نہ لگ جائے اس لیئے تمام اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء کرام معصوم ہیں اور اولیاء اللہ محفوظ ہیں۔ ان اولیاء ہ الا المتقون[1] متقی وہ ہے کہ جو بچا بچا کر قدم رکھے مگر کبھی پھسل جاتا ہے[2]۔

عالم الغیب فلایظہر علی غیبہ احدا الا من ارتضیٰ من رسول فیوحی

---

(۱) ۸: الانفال: ۳۴

(۲) عصمت انبیاء پر بحث گذشتہ اوراق میں بھی گذر چکی ہے

باذنه مایشاء[1].

(خدا تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے اپنے غیب کی باتیں کسی کو نہیں بتلاتا مگر جس کو اپنے لیے پسند کیا یعنی کسی رسول کو غیب کی کوئی خبر بذریعہ وحی کے بتلادیتے ہیں)۔

آیت کریمہ میں ارتضیٰ کا کوئی خاص متعلق ذکر نہیں فرمایا جس سے اشارہ عموم کی طرف ہے یعنی اللہ کا رسول ہر اعتبار سے اللہ جل شانہ کا مرضی اور پسندیدہ ہوتا ہے۔ رسول کے اخلاق اور اعمال، اقوال اور احوال سب ہی مرضی اور پسندیدہ ہوتے ہیں۔

(ف) ارتضیٰ کا ترجمہ ہم نے اس طرح کیا کہ جس کو خدا نے اپنے لیے پسند کرلیا۔ اپنے لیے کی قید اس لیے لگائی کہ ارتضاء باب افتعال سے ہے اور ائمہ لغت نے یہ لکھا ہے کہ باب افتعال اپنے لیے آتا ہے اور ثلاثی مجرد[2] عام ہے وہ اپنے اور غیر دونوں کے لیے آتا ہے لها ماکسبت و علیها مااکتسبت[3] کسب عام ہے خواہ اپنے لیے ہو یا غیر کے لیے وہ ہر صورت میں نافع ہے اور اکتساب خاص اپنے لیے ہوتا ہے اس لیے اکتساب کا ضرر اس کی ذات تک محدود رہے گا غیر تک متعدی نہ ہوگا۔

موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

واصطنعتک لنفسی[4]. اے موسیٰ میں نے تجھ کو خاص اپنے لیے بنایا ہے۔

---

(۱) ۷۲: الجن: ۲۶

(۲) ثلاثی مجرد: تین حرفی فعل جس میں مزید کوئی حرف شامل نہ ہو اور وہ فعل کے وزن پر ہو جیسے رضی

(۳) ۲: البقرہ: ۲۸۶

(۴) ۲۰: طٰہٰ: ۴۱

کما قال تعالیٰ: واذکر عبادنا ابراهیم واسحق و یعقوب اولی الایدی والابصار. انا اخلصناهم بخالصة ذکری الدار. وانهم عندنا لمن المصطفین الاخیار[1].

(ہمارے خاص بندوں کا ذکر کیجیے یعنی ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب جو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے یعنی قوۃ عملیہ اور قوۃ نظریہ کے اعتبار سے کامل اور مکمل تھے ہم نے ان کو خالص آخرت کی یاد کے لیے مخصوص کیا تھا اور یہ ہمارے پسندیدہ اور نیک بندوں میں سے ہیں)۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ [2] فرماتے ہیں کہ "نبوت کا دارومدار تین کمالوں پر ہے۔ اول یہ کہ نبی اللہ کا اس درجہ محب اور مخلص ہو کہ اس کے قلب میں ارادہ معصیت کی گنجائش ہی نہ ہو اور اس کا ظاہر اور باطن اللہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ دوم یہ کہ اس کے اخلاق نہایت حمیدہ اور پسندیدہ ہوں۔ سوم یہ کہ عقل اور فہم میں اس درجہ کامل ہو۔ کہ کوئی اس کا ثانی نہ ہو۔ اس لیے کہ یہ ناممکن ہے کہ غیر نبی نبی سے عقل اور فہم میں بڑھ جائے۔ خلاصہ کلام یہ کہ جن حضرات کے یہ صفات اور کمالات ہوں ان کے اقوال و افعال اور ان کے کلمات حکمت اور ملفوظات موعظت کے حجت ہونے میں کوئی شبہ ہوسکتا ہے"۔

---

(۱) ۳۸: ص: ۴۵

(۲) مولانا محمد قاسم نانوتوی م: ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء بانی دارالعلوم دیوبند

دلیل: ۱۵

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقوق

قرآن کریم نے خاص طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آداب اور حقوق کو بیان کیا ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ[1] نے "الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ" کے نام سے ایک ضخیم کتاب خاص اسی موضوع پر تصنیف فرمائی جس میں آیات اور احادیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقوق جو امت کے ذمہ ہیں وہ بیان فرمائے[2]۔

علامہ شہاب خفاجی رحمہ اللہ[3] نے "نسیم الریاض" کے نام سے چار جلدوں میں اس کی شرح تحریر فرمائی[4] اور علامہ قاری رحمہ اللہ[5] نے دو جلدوں میں اس کی تلخیص فرمائی جس سے مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب کے علماء باخبر ہیں۔

حقوق نبوی کی تفصیل تو بہت طویل ہے اس تمام تفصیل کا خلاصہ اور لب لباب تین امر ہیں محبت، عظمت اور اطاعت۔

حق محبت

یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی جان و مال اور تمام اہل و عیال سے

---

(۱) قاضی عیاض بن موسیٰ بن عیاض: م ۵۴۴ھ

(۲) قاضی عیاض کی یہ کتاب دار الکتاب العربی بیروت نے شائع کی ہے۔

(۳) شہاب خفاجی، احمد شہاب الدین الخفاجی

(۴) یہ شرح بھی قاضی عیاض احمد اور ملا علی قاری کے حاشیہ کے ساتھ دار الکتاب نے شائع کی ہے۔

(۵) علی بن سلطان محمد، م ۱۰۱۴ھ

زیادہ عزیز اور محبوب رکھے۔

کما قال تعالی: النبی اولی بالمؤمنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم[۱]

(نبی مومنین کے حق میں ان کی جان سے بھی زیادہ قریب ہے اور نبی کی بیویاں اہل ایمان کی مائیں ہیں)۔

اور ایک روایت میں ہے کہ "وھو اب لھم"[۲] یعنی نبی ان کا روحانی باپ ہے جیسا کہ سنن ابی داؤد میں ہے۔ "انما انالکم بمنزلۃ الوالد"[۳] میں تمہارے لیے بمنزلہ والد کے ہوں۔

پس جس طرح بیٹے کا جسمانی وجود باپ کے جسمانی وجود سے مشتق[۴] ہے اسی طرح مؤمن کا مؤمن ہونے کی حیثیت سے ایمانی وجود، نبی کے ایمانی وجود سے مشتق ہے۔ نبی اول المؤمنین ہونے کی وجہ سے ایمان کے ساتھ بالذات موصوف[۵] ہوتا ہے اور امتی ایمان کے ساتھ بالعرض موصوف ہے[۶]۔ جس طرح زمین کی روشنی آفتاب کا عکس اور پرتوہ ہوتی ہے، اسی طرح مؤمنین کا ایمان نبی کے ایمان کا عکس اور پرتوہ ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو روشنی زمین پر نظر آرہی ہے، وہ درحقیقت زمین سے اتنی قریب نہیں جتنی کہ آفتاب سے قریب ہے

---

(۱) ۳۳: الاحزاب: ۶

(۲) التفسیر الکبیر، ج ۲۵: ص ۲۹۵، تفسیر آیت مذکور

(۳) ابوداؤد، سنن ابی داؤد (۸) ج ۱: ص ۱۸ باب کراہیۃ استقبال القبلۃ عند قضاء الحاجۃ (۴) کتاب الطہارۃ

(۴) مشتق: ماخوذ

(۵) بالذات موصوف: ایسا وصف جو ذاتی ہو

(۶) بالعرض: ایسا وصف جو ذاتی نہ ہو بلکہ کسی دوسرے کا عکس ہو

کیونکہ آفتاب روشنی کا منبع اور سر چشمہ ہے۔ اسی طرح نبی کی ذات بابرکات ایمان اور ہدایت کا منبع اور سر چشمہ ہے اور مومنین کا ایمان اسی کا ایک عکس اور پرتوہ ہے اس لیے ایمان مومنین سے اتنا قریب نہیں جتنا کہ نبی سے قریب ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی قدس سرہ لکھتے ہیں کہ نبی نائب ہے اللہ کا۔ اپنی جان اور مال میں اپنا تصرف نہیں چلتا جتنا نبی کا چلتا ہے۔ اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنا روا نہیں اور اگر نبی حکم دیدے تو فرض ہو جائے[1]۔

قل ان کان آباؤکم و ابناءکم و اخوانکم و ازواجکم وعشیرتکم و اموال ن اقترفتموها وتجارة تخشون کسادها و مساکن ترضونها احب الیکم من الله ورسوله وجهاد فی سبیله فتربصوا حتی یاتی الله بامره. ان الله لایهدی القوم الفاسقین[2].

(آپ کہہ دیجئیے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال و دولت اور سرمایہ تجارت اور پسندیدہ مکانات اگر یہ چیزیں تم کو اللہ اور اس کے رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بارہ میں کوئی سخت حکم نازل فرمائے اور اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو اپنی ہدایت اور توفیق نہیں دیتا)۔

اس آیت میں تین وعیدیں ذکر فرمائیں۔ ایک یہ کہ اللہ کے حکم قہری کا انتظار کرو۔ دوم یہ کہ ایسے لوگ فاسق ہیں۔ سوم یہ کہ اللہ کی ہدایت اور توفیق سے محروم ہیں۔

---

(۱) شاہ عبدالقادرؒ

(۲) ۹: التوبہ: ۲۴

حق عظمت

یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ادب اور احترام کو پورا پورا ملحوظ رکھے

کما قال تعالیٰ:

(۱) اناارسلناک شاهداً ومبشراً و نذيراً لتؤمنوا بالله ورسوله وتعزروه وتوقروه وتسبحوه بكرة واصيلاً[۱].

(تحقیق ہم نے آپ کو شاہد اور مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا اے مسلمانو! یہ اس لیے کیا کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول کی مدد کرو اور اس کی پوری پوری تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اللہ کی پاکی بیان کرو)۔

(۲) یاایها الذین آمنوا لاتقدموا بین یدی الله ورسوله وتقوا الله ان الله سمیع علیم[۲].

(اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو یعنی کوئی قدم بغیر اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مت اٹھاؤ۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ خوب سنتا ہے اور جانتا ہے)۔

(۳) یاایها الذین آمنوا لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجهروا له بالقول کجهر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم و انتم لاتشعرون[۳].

(اے ایمان والو حضور پر نور کی مجلس کا پورا ادب اور احترام ملحوظ رکھو۔ اور حضور کی آواز پر اپنی آواز کو بلند نہ کرو اور نہ آپ کی مجلس میں اتنی زور سے بولو جیسا کہ ایک دوسرے سے بولتے ہو۔ حضور کے ادب میں پوری احتیاط

---

(۱) ۳۳: الاحزاب: ۴۵

(۲) ۴۹: الحجرات: ۱

(۳) ایضاً: ۲

رکھو۔ اس بے احتیاطی میں تمہارے اعمال کے حبط اور ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہے)[1]۔

لہذا جو لوگ احادیث نبویہ کے خلاف آواز اٹھارہے ہیں۔ وہ بدرجہ اولےٰ اس وعید کا مصداق ہوں گے۔

(۴) لاتجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضاً[2]۔

(نبی کے بلانے کو اپنے اندر ایک دوسرے کے بلانے کی برابر نہ سمجھو)۔

نبی کے بلانے سے حاضر ہونا فرض ہوجاتا ہے۔ آپ کا بلانا اوروں کے بلانے کی طرح نہیں۔ حضور جب بلائیں لبیک کہہ کر دوڑ پڑو۔ اور حضور کے وصال کے بعد حدیث نبوی کا بلانا حضور ہی کا بلانا ہے۔

یا یہ معنیٰ کہ مخاطبت میں حضور کے ادب و عظمت کا پورا پورا لحاظ رکھو۔ تمام لوگوں کی طرح حضور کا نام لے کر نہ پکارو۔ بلکہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یا نبی اللہ جیسے تعظیمی الفاظ سے حضور کو خطاب کرو۔

حق اطاعت

یہ ہے کہ دل و جان سے بہزار رضاء و رغبت حضور پر نور کے حکم کی تعمیل کرے۔ اور آپ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت اور حضور کی رضاء اور خوشنودی سمجھے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ[3] جو رسول کی

---

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے کی سزا اعمال کی بربادی بتائی گئی یہ ایسی سزا ہے جو حق تعالیٰ جل شانہ احکام الٰہی کو پسند نہ کرنے، اللہ کی ناپسندیدہ راہ پر چلنے، مادہ پرستی، نفاق، کفر، شرک اور ارتداد جیسے جرائم پر دیتے ہیں۔

(۲) ۲۴:النور:۶۳

(۳) ۴:النساء:۸۰

اطاعت کرے اس نے در حقیقت اللہ کی اطاعت کی۔ اللہ جل جلالہ کی اطاعت کا ذریعہ ہی یہ ہے کہ رسول کی اطاعت کی جائے۔

خلاصہ کلام

یہ کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ رب العزت کے نائب اور خلیفہ اعظم اور اس کی صفات کے مظہر اتم ہیں اللہ کے بعد آپ ہی کی محبت، عظمت اور اطاعت ذریعہ نجات آخرت ہے۔ پس آپ کے قول اور فعل اور آپ کی حدیث وسنت کے حجت ہونے میں کیا شبہ اور تردد ہو سکتا ہے۔

خبر واحد کی حجیت

خبر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خبر متواتر اور دوسری خبر واحد (خبر متواتر) اس خبر کو کہتے ہیں کہ جس کے بیان کرنے والے اس قدر مختلف اور بے شمار ہوں کہ عقل سلیم اتنے مختلف طبقوں کے آدمیوں کا مل کر ایک جھوٹ بنا لینے کو محال سمجھے۔ مثلاً شہر مکہ یا مدینہ کے متعلق بے شمار اور مختلف لوگ آکر خبر دیں تو شہر مکہ اور مدینہ کے موجود ہونے کا یقین کامل حاصل ہو جاتا ہے۔ اور یہ شبہ نہیں رہتا کہ ان آدمیوں نے کسی بند مکان میں بیٹھ کر متفقہ طور پر یہ خبر بنائی ہے اور پھر اس طرح سے اس کو مشہور کیا ہے۔ اس لیے کہ جب ایسے بے شمار افراد کہ جن میں سے بہت سے ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں اور نہ ایک کو دوسرے کی خبر کی خبر ہے۔ اتنے بے شمار اور مختلف افراد جب کسی خبر کو بے غرضانہ بیان کریں گے تو ایسی خبر سے سننے والوں کو ایسا ہی اطمینان اور یقین حاصل ہوگا جیسے کسی شئے کو دیکھ کر یقین اور اطمینان ہوتا ہے اس لیے کہ

خبر میں کذب کا احتمال یا تو غلط فہمی کے احتمال سے ہو گا یا غرض فاسد کے شائبہ سے۔ اور خبر متواتر ان دونوں احتمالوں سے پاک ہے۔ بے شمار اور مختلف افراد کا بیان کرنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ یہ خبر چند غرض مند لوگوں کی بنائی ہوئی نہیں۔ اور اتنے بے شمار افراد بد عقل اور بد فہم بھی نہیں کہ جن کے متعلق غلط فہمی کا شبہ ہو سکے۔ لہذا جب خبر غلط فہمی اور غرض فاسد کے شائبہ سے پاک ہوئی تو لامحالہ مفید یقین اور موجب اطمینان ہو گی۔

(خبر واحد) وہ خبر ہے جس کے بیان کرنے والے اس قدر کثیر اور بے شمار نہ ہوں جس قدر متواتر ہوتے ہیں۔ خواہ ایک یا دو ہوں یا تین اور چار ہوں۔ یہ خبر واحد کہلاتی ہے۔

تمام عقلاء کے نزدیک جس طرح خبر متواتر معتبر اور مفید علم ہے اسی طرح خبر واحد بھی معتبر اور مفید علم ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ خبر متواتر سے علم قطعی اور یقینی حاصل ہوتا ہے اور خبر واحد سے علم ظنی یعنی ظن غالب حاصل ہوتا ہے، آج تک کسی عاقل نے خبر واحد کو غیر مفید اور غیر معتبر نہیں بتلایا۔ بلکہ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی خبر کا راوی ایک ہی شخص ہو مگر سچا اور ثقہ[1] ہو تو اس کی خبر بھی معتبر، قابل قبول اور واجب العمل ہے۔ اس لیے کہ اصل کلام اور اصل خبر کی وضع صدق اور بیان واقعہ کے لیے ہے۔ اسی وجہ سے عقلاء اور حکماء کا قول ہے کہ الفاظ تو صدق ہی کے لیے وضع کئے گئے ہیں۔ کذب کے لیے وضع نہیں کئے گئے خبر کی دلالت تو صدق ہی پر ہوتی ہے۔ خبر میں کذب کا احتمال باہر سے

(۱) ثقہ: قابل بھروسہ

آتا ہے[1]۔ نیز من جانب اللہ انسان کی جبلت اور فطرت میں یہ ودیعت رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے بنی نوع اور ابناء جنس[2] کو نفع پہنچائے اور ضرر سے ان کو محفوظ رکھے۔ لہذا برادرانہ محبت اور انسانی فطرت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ صدق اور بیان واقعہ سے ان کو فائدہ پہنچائے اور کذب اور خلاف واقعہ بیان کی مضرت سے ان کو محفوظ رکھے۔ اس لئے صدق اور بیان واقعہ اعلیٰ ترین سامان منفعت ہے اور کذب اور خلاف واقعہ بیان بد ترین سامان مضرت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسان اصل فطرت اور جادۂ اخوت و محبت سے جب ہی منحرف ہوگا کہ جب کوئی غرض فاسد اور غلط فہمی اس کو لاحق ہوگی۔ جس کی وجہ سے وہ قصداً یا سہواً اور خطاً کذب اور دروغ کا مرتکب ہوگا۔ اور جب قرائن اور احوال سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ یہ شخص سچا اور ثقہ ہے۔ اور انسانی فطرت پر قائم ہے۔ اپنے ابنائے جنس کو خلاف واقعہ بیان سے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچانا چاہتا تو ایسے شخص کی خبر کے متعلق عقل سلیم کا فتویٰ یہی ہے کہ اس کی خبر کو قابل قبول اور واجب العمل قرار دیا جائے۔ اس لیے کہ جب ایک کاذب اور ایک غیر ثقہ کی خبر بالاجماع ناقابل قبول ہے تو اس کی نقیض[3] اور

---

(۱) کوئی بھی خبر اپنی اصلیت کے اعتبار سے کسی صحیح واقعہ کی سچی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ہوتی ہے کسی خبر کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی البتہ اس کو جھوٹ ثابت کرنے کے لیے دلائل کا سہارا لیا جاتا ہے کیونکہ اس میں جھوٹ کا امکان کسی خارجی عامل کی وجہ سے ہوتا ہے۔

(۲) ابناء جنس: بنی نوع انسان

(۳) نقیض: ضد، مقابل

ضد یعنی ایک سچے اور ثقہ کی خبر بلاشبہ عقلاً قابل قبول اور واجب العمل ہونی چاہیے ورنہ نقیضین اور ضدین کا ایک حکم ہونا لازم آئے گا۔ کہ کاذب کی خبر کی طرح صادق کی خبر بھی معتبر ہو اور اس طرح صادق اور کاذب برابر ہوجائیں[1]۔

نیز ایک سچے اور ثقہ آدمی کی خبر میں دیدہ و دانستہ کذب کا احتمال نہیں اس لیے کہ جو شخص دیدہ و دانستہ جھوٹ بولے وہ نہ سچا کہلا سکتا ہے اور نہ ثقہ۔ البتہ ایک صادق اور ثقہ کی خبر میں خطا اور غلطی کا احتمال ضرور ہے مگر وہ احتمال مغلوب ہے اور قلیل الوقوع ہے۔ اور مغلوب، قلیل اور شاذو نادر قابل اعتبار نہیں۔ لہذا ترجیح غالب اور کثیر کو رہے گی۔ شک کا اس لیے اعتبار نہیں کہ اس میں دونوں جانبیں برابر ہیں۔ وہم کا اس لیے اعتبار نہیں کہ اس میں ظلمت جہل کی غالب ہے۔ اور نور علم اور روشنی معرفت اس میں مغلوب اور قلیل ہے۔ لہذا جہاں نور علم غالب ہو اور ظلمت جہل مغلوب ہو جیسے ظن غالب وہاں عقل کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس کا اعتبار کیا جائے قلیل ظلمت کی وجہ سے نور کثیر کا ترک سراسر خلاف عقل ہے۔ علم یقینی جو خبر متواتر سے حاصل ہو اس کا نور ایسا ہے کہ جیسا آفتاب کا نور ہے جس میں ظلمت اور تاریکی کا نام و نشان نہیں اور علم ظنی جو خبر واحد سے حاصل ہو اس کی مثال نور قمر کی سی ہے کہ جس میں روشنی غالب ہے اور ظلمت کا بھی اس میں شائبہ ہے۔ اس طرح خبر واحد میں صداقت اور عدالت غالب ہے۔ اور جانب مخالف محض احتمال کے درجہ میں ہے لیکن

---

(۱) یعنی جب خبر دینے والے کی سچائی مسلم ہو تو خبر کے صحیح ہونے کا امکان زیادہ قوی ہو جاتا ہے اگر کسی سچے آدمی کی خبر بھی قابل اعتبار نہیں تو جھوٹے اور سچے کی خبر برابر ہو جائے گی۔

احتمال خبر کی وثاقت[1] اور موجب طمانیت[2] ہونے میں قادح[3] نہیں۔ اس لیے کہ یہ احتمال محض احتمال عقلی ہے کسی دلیل اور منشا پر مبنی نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ محض احتمال عقلی جس کا کوئی منشا اور ماخذ نہ ہو وہ عقلاً معتبر نہیں۔

اور اگر محض ان بے دلیل احتمالات عقلیہ اور خیالات وہمیہ کی بنا پر ایک سچے اور ثقہ آدمی کی خبر کو محض اس وجہ سے رد کر دیا جائے کہ وہ درجہ تواتر کو نہیں پہنچی تو کار خانہ عالم۔ درہم برہم ہو جائے۔ اس لیے کہ عالم کے تقریباً تمام تر کاروبار اخبار احاد پر چل رہے ہیں۔ رسل و رسائل، نامہ و پیام، تار اور ٹیلفیون کی گاڑی سب خبر واحد ہی سے چل رہی ہے۔ سرکاری دفاتر کے مراسلات اور پیغامات کے سلسلہ سند کے تمام راوی از اول تا آخر یہی بے علم اور بے عمل چپراسی نہیں تو اور کون ہے۔

حیرت کا مقام ہے کہ ان منکرین حدیث کو چپراسیوں کی سند سے احکام وزارت میں کوئی شبہ نہیں آتا اور مالک عن نافع عن ابن عمر کی سند میں ان کو فقط شبہ اور تردد ہی نہیں بلکہ یہ سلسلۃ الذہب ان کے نزدیک ناقابل اعتبار ہے۔

سبحان اللہ۔ مالک اور نافع جن کا علم اور تقویٰ امت محمدیہ میں آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔ ان کی روایت تو ان منکرین حدیث کے نزدیک حجت نہیں اور گھر اور دفتر کے نوکروں اور چپراسیوں کی اخبار

---

(۱) وثاقت: خبر کا قابل اعتبار ہونا

(۲) موجب طمانیت: وجہ اطمینان

(۳) قادح: رکاوٹ

آحاد ان کے نزدیک معتبر ہیں۔

تمام عالم کے سلاسل انساب سب کے سب ظنی ہیں۔ فقط ماں کا علم قطعی اور یقینی ہے اور باپ کا ظنی ہے بلکہ ایک اعتبار سے ماں کا علم بھی ظنی ہے اس لیے کہ ولادت کی راوی بھی صرف ایک دو عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ جو خبر واحد ہے متواتر نہیں مگر اسی ظن پر تمام قرابتیں اور بیاہ اور نکاح چل رہے ہیں اور اسی ظنی نسب پر تمام وراثتیں تقسیم ہو رہی ہیں۔ یہ بہن ہے اور یہ بھائی ہے اور یہ خالہ ہے اور یہ پھوپھی ہے۔ کیا ان منکرین حدیث کے نزدیک ان کی قرابتوں کے راوی بخاری اور مسلم کے راویوں سے زیادہ ثقہ ہیں اور حد تواتر کو پہنچے ہوئے ہیں۔

اے منکرین حدیث! اگر حق جل شانہ قیامت کے دن تم سے یہ سوال فرمائیں کہ کیا مالک اور بخاری و مسلم تمہارے نوکروں اور چپراسیوں سے بھی گئے گذرے تھے کہ ان کی روایتوں کو موضوعات اور مفتریات[1] کا انبار بتلا کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اور دفتر کا ایک معمولی چپراسی کسی حاکم کا پیغام لے کر آیا تو سنتے ہی دوڑ پڑے اور کوئی سپاہی وارنٹ لے کر آیا تو فوراً اس پر دستخط کردے اور اس کی صداقت اور ثقاہت کی کوئی تحقیق نہ کی اور نہ یہ شبہ ہوا کہ یہ خبر واحد ہے اور ظنی ہے اس کا کیا اعتبار؟۔

منکرین حدیث بتلائیں کہ قیامت کے دن خداوند ذوالجلال کے سامنے اس سوال کا کیا جواب دیں گے؟

---

(۱) مفتریات: جھوٹی باتیں

خلاصہ کلام

یہ کہ خبر واحد بشرطیکہ بیان کرنے والا سچا اور ثقہ ہو وہ بلاشبہ مفید علم اور موجب اطمینان ہے۔ اور احتمال کذب اور خطا کی وجہ سے جو اس میں ظنیت ہے وہ محض عارضی اور خارجی امر ہے اس کی حقیقت سے بالکل خارج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی اخبار آحاد مل کر متواتر بن جاتی ہیں اور مفید یقین و اطمینان ہوتی ہیں۔ اگر ظنیت اخبار آحاد کی حقیقت میں داخل ہوتی تو کثرت اور اجتماع کی صورت میں وہ ظنیت مبدل بہ یقین واطمینان نہ ہو سکتی اس لیے کہ مقتضائے حقیقت اجتماع و افتراق میں بدلتا نہیں[1]۔ ماہیت[2] اور ماہیت کے لوازم کبھی نہیں بدلتے۔ البتہ عوارض اور احوال شخصیہ بدلتے رہتے ہیں خبر متواتر کا ہر فرد اگرچہ ظنی ہے مگر یہ ظنیت اس کے عوارض شخصیہ میں سے ہے جو حالت انفراد کی وجہ سے عارض ہوئی تھی حالت اجتماع میں وہ انفراد باقی نہ رہا۔ اس لیے ظنیت تو ختم ہوئی اور خبر کا جو طبعی اور ذاتی اقتضاء تھا یعنی دلالتہ علی الصدق، مفید علم اور موجب طمانیت ہونا۔ اجتماع کی وجہ سے اس کی اصلی حقیقت میں اس درجہ شدت اور قوت آگئی کہ ظنیت سے نکل کر قطعیت کے مقام پر پہنچ گئی۔ اس لیے کہ ظنیت خبر واحد کی نفس حقیقت کا مقتضیٰ نہ تھا بلکہ

---

(۱) یعنی اصل حقیقت انفرادی صورت ہو یا اجتماعی بدلتی نہیں ہے مثلاً دس جھوٹے اگر ایک جھوٹی خبر دیں تو اس میں تعداد کی زیادتی کی وجہ سے صداقت کا امکان پیدا نہیں ہوگا البتہ جب دس سچے انسان ایک خبر دیں تو خبر کی اصلی صداقت میں اضافہ ہوگا۔

(۲) ماہیت: اصل حقیقت

انفراد کی وجہ سے عارض ہوئی تھی جب اجتماع کی وجہ سے وہ انفراد ختم ہوا تو وہ ظنیت عارضہ بھی ختم ہوئی خوب سمجھ لو[1] یہ تحقیق انیق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند قدس اللہ سرہ کے ایک فارسی مکتوب سے (جو قاسم العلوم میں طبع ہوا ہے) لی گئی ہے امید ہے کہ اصحاب ذوق ووجدان کے لیے موجب سکون واطمینان ہوگی۔

خبر واحد کی حجیت کا ثبوت قرآن کریم سے

خبر واحد کی حجیت پر جو کلام کیا وہ عقلی حیثیت سے تھا۔ اب ہم خبر واحد کا حجت ہونا قرآن کریم سے ثابت کرتے ہیں۔

(۱) قال تعالیٰ: یاایھاالذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالة فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین[2]۔

(اے ایمان والو! ایمان کا مقتضے یہ ہے کہ اگر کوئی فاسق وفاجر تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کے قبول میں عجلت سے کام نہ لینا بلکہ

---

(۱) یعنی چونکہ خبر اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے سچائی پر مبنی، وجہ اطمینان اور حصول علم کا ذریعہ ہے یہ تمام امور خبر میں احتمال غالب کے درجہ میں موجود ہیں جب چند قابل اعتبار اور سچے لوگوں نے خبر آپ تک پہنچائی تو احتمال یقین کے درجہ کو پہنچ گیا۔ جبکہ مخبرین کی تعداد کم ہونے سے احتمال، احتمال ہی رہا یقین کے درجہ تک نہیں پہنچا۔ لیکن اسے جھوٹ ثابت کرنے کے لیے کسی قوی دلیل کی ضرورت ہے، محض اس وجہ سے کسی خبر کو بالکل جھوٹا اور ناقابل اعتبار نہیں قرار دیا جاسکتا کہ اس کو نقل کرنے والوں کی تعداد کم ہے جب تک نقل کرنے والوں میں سے کسی کو جھوٹا یا ناقابل اعتبار نہ ثابت کردیا جائے۔

(۲) ۴۹:الحجرات:۶

اس خبر کی تحقیق کرنا خدا نخواستہ نادانی کی وجہ سے کسی قوم کو ضرر نہ پہنچادو اور پھر اپنے کیئے ہوئے پر نادم اور پشیمان ہو)۔

معلوم ہوا کہ اگر سچا اور ثقہ کوئی خبر لے کر آئے تو اس کو قبول کرو۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ فاسق کی خبر بھی مطلقاً رد نہ کرنی چاہئیے بلکہ اس کی تحقیق کرنی چاہئیے پس اگر شخص واحد کی خبر سرے ہی سے قابل رد اور ناقابل قبول ہوتی تو پھر تبین اور تثبت یعنی اس کی تحقیق کا حکم دینے کے بجائے اس کے رد کرنے کا حکم دیتے اور یہ فرماتے کہ اگر ایک شخص خبر لے کر آئے تو اس کو ہرگز قبول نہ کرنا جب تک درجۂ تواتر کو نہ پہنچ جائے۔

(۲) فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الھیم لعلھم یحذرون[1]۔

(قبیلہ اور گروہ میں سے کچھ آدمی ایسے کیوں نہ نکلے کہ جو علم دین حاصل کریں اور فارغ ہونے کے بعد اپنی قوم کو آکر علم دین سے آگاہ اور باخبر کریں تاکہ وہ اللہ کی معصیت سے بچیں)۔

طائفہ لغت میں جماعت کے ایک حصہ کو کہتے ہیں خواہ وہ ایک شخص ہو یا دو تین ہوں۔ معلوم ہوا کہ اگر ایک دو آدمی بھی دین کی باتیں سیکھ کر اپنی قوم کو جا کر بتلائیں تو قوم کے ذمہ ان کی بات کو قبول کرنا اور ماننا واجب ہے۔

(۳) وجاء رجل من اقصی المدینۃ یسعی قال یا موسی ان الملا یاتمرون بک لیقتلوک فاخرج انی لک من الناصحین. فخرج منھا خائفا یترقب قال

---

(۱) ۹: التوبہ: ۱۲۲

رب نجنی من القوم الظالمین[1]

(اور ایک شخص منتہائے شہر سے دوڑتا ہوا آیا جو موسیٰ علیہ السلام کا محب اور خیر خواہ تھا، آکر موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے موسیٰ فرعون کے دربار کے لوگ آپ کے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں پس میری رائے یہ ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں میں آپ کے خیر خواہوں میں سے ہوں موسیٰ علیہ السلام یہ خبر سنتے ہی فوراً مصر سے روانہ ہوگئے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے پروردگار مجھ کو ظالموں سے نجات دے)۔

موسیٰ علیہ السلام نے خبر واحد پر عمل فرمایا اور اس پر بھروسہ اور اعتماد کر کے روانہ ہوئے۔

(۴) پھر موسیٰ علیہ السلام مدین میں پہنچے۔ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی موسیٰ علیہ السلام کو بلانے آئیں۔

قالت ان ابی یدعوک[2]. اور یہ کہا کہ میرے باپ شعیب علیہ السلام تم کو بلا رہے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام اس ایک عورت کے کہنے سے اٹھ کر روانہ ہوئے۔

(۵) بڑے بڑے حقوق مالیہ اور بدنیہ کا دو گواہوں کی شہادت سے ثابت ہو جانا قرآن کریم، احادیث متواتر اور اجماع علماء سے ثابت ہے۔ ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کی گواہی خبر واحد کا درجہ رکھتی ہے۔ دو آدمیوں کی شہادت اور روایت سے تواتر کسی کے نزدیک بھی ثابت نہیں ہوتا۔

(٦) نیز خدا کا نبی اور رسول ایک ہی شخص ہوتا ہے کہ جو یہ خبر دیتا ہے کہ

(۱) ۲۸: القصص: ۲۰

(۲) ایضاً: ۲۵

یہ اللہ کی کتاب اور اللہ کی وحی مجھ پر نازل ہوئی۔ پس اگر ایک شخص کی کوئی خبر مطلقاً قابل قبول نہیں تو پھر ایک رسول کی خبر پر ایمان لانا کیوں فرض ہوا اور اس کا نہ ماننا کیوں کفر ہوا۔

(۷) ہجرت کے بعد سولہ یا سترہ مہینہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی گئی۔ جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا۔ فول وجھک شطر المجسد الحرام[۱] تو ایک صحابی یہ حکم سن کر قباء پہنچے اہل قباء بیت المقدس کی طرف نماز ادا کر رہے تھے۔ ان صحابی نے باواز بلند کہا کہ اپنا رخ بیت اللہ کی طرف کرلو۔ یہ سنتے ہی تمام لوگوں نے نماز ہی میں بیت اللہ کی طرف اپنا رخ کرلیا۔ یہ ایک ہی شخص کی تو خبر تھی کہ جس کی بناء پر گذشتہ حکم قطعی کو چھوڑ دیا اور خبر متواتر کا انتظار نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ ایک صادق اور ثقہ کا قول قابل قبول اور واجب العمل ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ نے بھی اس پر کوئی انکار نہیں فرمایا کہ تم لوگ ایک شخص کی خبر پر کیسے حکم قطعی کو چھوڑ بیٹھے[۲]۔

(۸) صحابہ کرام حضور سے حدیثیں سن کر اپنے اپنے بلاد[۳] میں جاتے اور لوگوں سے حضور کی حدیثیں بیان کرتے جس شہر میں صحابی نے حضور کی حدیث بیان کی۔ لوگوں نے بے چون و چرا اس حدیث کو سر اور آنکھوں پر رکھا اور کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم ایک شخص کی روایت قبول نہیں کریں گے جب تک یہ حدیث درجہ تواتر کو نہ پہنچ جائے صحابہ اور تابعین کا

---

(۱) یعنی آپ مسجد حرام کی طرف اپنا رخ پھیر لیجئے۔ ۲: البقرہ: ۱۴۴

(۲) ابن ہشام، سیرۃ النبی ﷺ: ج ۱: ص

(۳) بلاد: شہر

قرن[1] اسی طرح گذرا معلوم ہوا کہ خبر واحد کی حجیت صحابہ اور تابعین میں مسلم تھی۔

ایک ضروری تنبیہ

لفظ ظن کلام عرب میں دو معنے میں مستعمل ہوتا ہے ایک گمان غالب جو کسی دلیل عقلی یا نقلی کی بناء پر پیدا ہو مگر قطعی نہ ہو اصطلاح میں اس کو دلیل ظنی کہتے ہیں جو عام عقلاء کے نزدیک حجت ہے لیکن حجیت میں دلیل ظنی کا درجہ دلیل قطعی کے بعد ہے۔ اور ایسے ظن کا اتباع باجماع عقلاء واجب ہے الا یہ کہ دلیل قطعی اس کے معارض ہو[2] ظن کے دوسرے معنیٰ اٹکل اور تخمین کے ہیں۔ یعنی محض اپنے خیال اور نفسانی خواہش سے بے دلیل اور بے تحقیق بات کا پیدا ہونا قرآن کریم میں اسی قسم کے ظن کی اتباع کی ممانعت کی گئی ہے۔

دوسری تنبیہ

دین کے تمام اصول اور قواعد کلیہ جن پر دین کی بنیاد قائم ہے وہ سب قطعی ہیں۔ دلائل قطعیہ سے ثابت ہیں۔ البتہ دین کے فروعی مسائل ظنی ہیں۔ یعنی دلیل ظنی سے ثابت ہیں۔ معاذ اللہ ان کے ظنی ہونے کے یہ معنیٰ نہیں کہ وہ محض تخمین سے تراشے گئے ہیں۔

نماز، روزہ، زکوۃ، حج، جہاد، نکاح اور طلاق وغیرہ وغیرہ یہ تمام امور قطعی ہیں۔ کتاب اللہ اور احادیث متواترہ سے ثابت ہیں۔ مگر ان کی فروعی

---

(۱) قرن: زمانہ

(۲) سوائے اس صورت کے جبکہ کوئی قطعی دلیل اس کے مقابلہ میں موجود ہو۔

تفصیلات ظنی ہیں، اخبار آحاد[1] سے ثابت ہیں۔ فرداً فرداً ظنی ہیں مگر اصول کلیہ اور قطعیہ کے تحت میں مندرج ہیں۔ اصل قانون کلی قطعی ہوتا ہے اور اس کی اکثر تشریحات اور تفصیلات ظنی ہوتی ہیں مگر وہ تمام جزئیات اسی قانون کلی کے تحت میں مندرج اور مندمج[2] ہوتی ہیں۔

تیسری تنبیہ

دلیل قطعی اس کو کہتے ہیں کہ جس کا ثبوت بھی قطعی ہو اور اس کی دلالت علی المعنیٰ بھی قطعی ہو۔ یعنی معنیٰ مرادی کے علاوہ کسی اور معنیٰ کا اس میں احتمال نہ ہو۔ آیات قرآنیہ تمام کی تمام قطعی الثبوت ہیں۔ ان کے ثبوت میں ذرہ برابر کسی قسم کا شبہ نہیں البتہ دلالت علی المعنیٰ میں مختلف ہیں۔ بعض آیات کی دلالت کسی معنیٰ اور مفہوم پر قطعی اور صریح ہے اور بعض کی دلالت کسی خاص مفہوم اور خاص معنیٰ پر ظنی ہے مثلاً ایک لفظ لغت میں متعدد معنیٰ کے لیے آتا ہے یا اس لفظ کے معنیٰ میں ائمہ لغت کا اختلاف ہے۔ یا کسی اعرابی[3] یا بلاغی[4] مسئلہ میں ائمہ نحو اور ائمہ بلاغت کا اختلاف ہے تو ایسی صورت میں لفظ قرآنی کی دلات اپنے معنیٰ پر قطعی نہ ہوگی۔ بلکہ ظنی ہوگی اور متعدد معانی کی محتمل ہوگی اور جو احکام اس قسم کی آیات سے ثابت ہوں گے وہ بھی ظنی ہوں گے قطعی نہ ہوں گے۔

---

(۱) اخبار آحاد: خبر واحد کی جمع یعنی بہت ساری خبر واحد

(۲) مندمج: لپٹی ہوئی

(۳) اعرابی: قواعد عربیت کی رو سے کسی لفظ کی خاص حالت

(۴) بلاغی: فصاحت و بلاغت

پس اگر اخبار آحاد ظنی ہونے کی وجہ سے قابل رد ہیں تو منکرین حدیث بتلائیں کہ ان احکام کے متعلق کیا رائے ہے کہ جو کتاب اللہ سے ظنی طور پر ثابت ہوں کیا وہ بھی معاذاللہ حدیث کی طرح آپ کی نزدیک قابل رد ہیں۔ ع
حفظت شیئا وغابت عنک اشیاء۔ اپنے مطلب کی ایک چیز یاد کرلی اور باقی سب غائب۔

خلاصہ کلام

یہ کہ اصول دین سب قطعی ہیں۔ البتہ فروعی مسائل بہت سے قطعی ہیں جو بطریقہ تواتر ثابت ہیں۔ اور بہت سے ظنی ہیں جو اخبار آحاد اور قیاسات صحیحہ سے ثابت ہیں۔ قطعی امور کا انکار کفر ہے اور ظنی امور کا انکار گمراہی ہے علم طب کے صدہا بلکہ ہزارہا مسائل ظنی ہیں۔ مگر اس وجہ سے علم طب کو پھینک نہیں دیا جاتا اور جو شخص علم طب کو ظنی مسائل پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بیکار اور نا قابل اعتبار بتائے وہ صحیح الدماغ نہیں۔

حصّہ دوم

منکرین حدیث
کے
شبہات، جوابات

منکرین حدیث کے شبہات اور ان کے جوابات

پہلا شبہ

احادیث عہد نبوی میں تو کتابۃً جمع نہیں ہوئیں۔ البتہ محض زبانی طور پر نقل در نقل کا سلسلہ رہا۔ کتابی شکل میں ایک عرصہ دراز کے بعد مدون ہوئیں اور ظاہر ہے کہ عرصہ دراز تک بعینہ الفاظ کا محفوظ رہنا فطرۃً اور عادۃً محال ہے اور جب الفاظ محفوظ نہ رہے تو معانی کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو شئے نہ لفظاً محفوظ ہو اور نہ معنیً وہ حجت کیسے ہو سکتی ہے۔

جواب

کسی روایت اور خبر کا بعینہ اور بلفظہ[1] محفوظ رہنا دو باتوں پر موقوف ہے۔ اول قوت حافظہ پر۔ دوم مروی عنہ[2] کے ساتھ تعلق پر یعنی جس سے روایت کی جائے۔ راوی کا اس مروی عنہ سے خاص تعلق ہو۔ اور تعلق دو قسم کا ہوتا ہے ایک عظمت کا اور ایک محبت کا۔ جس شخص کی کسی کے دل میں محبت یا عظمت ہوگی اس کی بات نہیں بھول سکتا۔ محبت اور عظمت میں سے اگر ایک بات بھی پائی جائے تو ضعیف الحافظہ بھی قوی الحافظہ بن جاتا ہے۔

بادشاہ یا وزیر اگر کسی سے کوئی خطاب کرے تو عظمت اور ہیبت کی وجہ سے اس کے الفاظ بعینہ یاد رہ جاتے ہیں۔ خصوصاً اگر بادشاہ یہ بھی کہہ دے کہ میرا یہ حکم لوگوں تک پہنچا دیا جائے، اپنی طرف سے میرے حکم

---

(۱) بعینہ و بلفظہ: بلکل اسی طرح، انہی الفاظ کے ساتھ۔

(۲) مروی عنہ: جس کی کوئی بات نقل کی جارہی ہے۔

میں ذرہ برابر تغیر و تبدل اور کسی قسم کی کمی بیشی نہ کی جائے، جو شخص ذرا بھی میرے حکم میں تغیر و تبدل کرے گا تو اس کو یہ سزا ملے گی اور جو بعینہ اور بلفظہ میرے حکم کو پہنچائے گا تو اس کو یہ انعام ملے گا تو کیا ایسی صورت میں کوئی تغیر و تبدل ہوسکتا ہے حاشا و کلا ہر گز نہیں۔ سنتے ہی تمام الفاظ فقط اس وقت کے لیے نہیں بلکہ تمام عمر کے لیے نقش کالحجر[1] ہوجائیں گے یہ تو عظمت کی کیفیت ہوئی اور محبت کی کیفیت یہ ہے کہ اگر محبوب اپنے محب کو خطاب کرے تو محبت اور عشق کی وجہ سے بعینہ الفاظ تو کیا محبوب کا لب و لہجہ بھی دل میں اتر جاتا ہے۔

اذ مابدت لیلی فکلی اعین وانھی ناجتنی فکلی مسامع

(جب کبھی لیلیٰ سامنے آتی ہے تو میرا ہر جزو آنکھ بن جاتا ہے اور جب لیلیٰ مجھ سے بات کرتی ہے تو میرا ہر جزو بدن کان اور گوش ہوش بن جاتا ہے)۔

الغرض جس کو کسی سے محبت یا عظمت کا تعلق ہوتا ہے اس کی بات ہر گز نہیں بھولتا۔ حافظہ اگر کمزور ہو تو محبت اور عظمت حافظہ کو نہایت قوی بنا دیتی ہے۔ آج کل کے نوجوان کو دیکھ لیجئے ان کو کتنے عشقیہ اشعار یاد ہوتے ہیں اور ناولوں کے صفحے کے صفحے ان کو ازبر ہوتے ہیں۔ غزلیات اور ہزلیات تو ان کو ایک ہی دفعہ سن کر یاد ہوجاتی ہیں۔ اور حساب اور فلسفہ کی چند ورقہ کتاب سال بھر میں بھی یاد نہیں ہوتی۔ قوت حافظہ دونوں جگہ ایک ہے۔ فرق فقط محبت اور شوق و رغبت کا ہے۔

اس اجمالی تمہید کے بعد خیال فرمائیں کہ عرب کا حافظہ چار دانگ

---

(۱) نقش کالحجر: پتھر پر نقش

عالم میں مشہور ہے۔ اور مسلمات تاریخ سے ہے حضرات صحابہ، تابعین، محدثین اور ائمہ لغت کے حافظہ کی حکایات اور روایات سے دنیا کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ قریب زمانہ ہی میں ایسے لوگ گذرے ہیں کہ جن کا حافظہ قابل تعجب ہے۔ جیسے فیضی[۱] اور ابو الفضل[۲] کہ ایک ہی دفعہ طویل قصیدہ سن کر ان کو یاد ہوجاتا تھا۔ اور ہمارے زمانہ میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب قدس اللہ سرہ[۳] کا حافظہ تمام ہندوستان میں مشہور و معروف ہے سنہ ۱۳۵۴ھ میں اسی ناچیز نے حافظ العصر شیخ بدرالدین رح[۴] کی دمشق میں زیارت کی ہے جن کے متعلق مصر اور شام کے علماء اس بات کے عینی شاہد اب بھی موجود ہیں کہ ان کو صحیح بخاری اور صحیح مسلم حفظ یاد تھیں۔ نیز اس ناچیز نے شیخ صالح تنبکتی کو مسجد نبوی میں حفظاً صحیح بخاری کا درس دیتے ہیں بچشم خود دیکھا ہے کہ جب شیخ صالح درس کے لیے تشریف لاتے تو صحیح بخاری کا پورا ایک باب مع سند اور متن کے حاضرین کے سامنے محض اپنے حفظ سے بلا کتاب سامنے رکھے ہوئے تلاوت فرماتے اور پھر ترجمۃ الباب[۵] اور رجال سند[۶] اور حقائق متن پر کلام فرماتے۔ جس کا جی چاہے علماء مدینہ سے جاکر اس خبر کی تصدیق کرلے۔ شیخ موصوف کو دنیا سے رحلت فرمائے ہوئے ابھی دس بارہ ہی سال گذرے

---

(۱) فیضی: ابوالفیض فیضی: م ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء جو سواطع الالہام (تفسیر بے نقط) کے مؤلف ہیں۔

(۲) ابوالفضل: م ۹۵۵ھ/۱۵۵۱ء ابوالفیض فیضی کے والد کے استاد

(۳) مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ: م ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء

(۴) شیخ بدرالدین: علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد: م ۸۵۰ھ بخاری کی شرح عمدۃ القاری کے مؤلف

(۵) ترجمۃ الباب: عنوان باب

(۶) رجالِ سند: حدیث کے راوی

ہیں۔ ان کے دیکھنے والے مدینہ منورہ میں بکثرت موجود ہیں۔
اور اسی طرح ناچیز نے حافظ العصر شیخ شنقیطیؒ کو دیکھا ہے کہ ان کو بھی بخاری اور مسلم تقریباً متناً و سنداً زبانی یاد تھی مسجد نبوی میں درس دیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق بھی اہل مدینہ سے دریافت کرلیا جائے۔ نیز میں نے ہندوستان اور اہل حرمین کے اکابر علماء، ثقات اور اثبات سے سنا ہے کہ شیخ شعیب قرشی شیخ الحدیث جامع الزیتونہ تونس کو صحیح بخاری حفظ یاد تھی اور بلا کتاب سامنے رکھے ہوئے صحیح بخاری کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

عظمت اور محبت

حضرات صحابہؓ کو آنحضرت ﷺ سے جو عظمت اور محبت کا تعلق تھا، ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اولین اور آخرین میں کہیں اس کی نظیر تو کیا اس کا عشر عشیر (۱) بھی نہیں مل سکتا۔ عظمت کا یہ حال تھا کہ صحابہ جب حضور ﷺ کی مجلس میں بیٹھتے تو کان علی رؤسنا الطیر کی شان ہوتی۔ یعنی صحابہ آپ کی مجلس میں ایسے سکون اور خاموشی کے ساتھ بیٹھتے کہ گویا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ پرندہ اولاً تو آدمی کے سایہ ہی سے بھاگتا ہے اور اگر کوئی حس و حرکت محسوس کرلے تو پھر ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ صحابہ کی محویت کا یہ عالم تھا کہ پرندے بھی ان سے متوحش نہیں ہوتے تھے۔ صحابہ کی محبت یہ عالم تھا کہ جب آنحضرت ﷺ وضو فرماتے، تھوکتے یا سنکتے، آپ کے وضو کا پانی، تھوک اور سنک زمین پر گرنے نہیں پاتا تھا۔ صحابہ کرام اس کو ہاتھوں ہاتھ لے

---

(۱) عشر عشیر: بیسواں حصہ (ایک فیصد)

لیتے تھے اور بدن پر مل لیتے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ دنیا کی عظمت اور محبت کا کوئی تعلق، صحابہ کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ اور اس شعر کا اصل مصداق حضرات صحابہ ہیں۔

افروختن و سوختن وجامہ دریدن   پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت[۱]

غرض یہ کہ حضرات صحابہ، حضور پر نور کی محبت اور عظمت میں درجہ فناء کو پہنچے ہوئے تھے۔ اور صحابہ کے بعد پھر یہی مقام تابعین اور تبع تابعین کو حاصل ہوا۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ محبین اور عشاق اپنے محبوب کے ملفوظات اور اس کے حالات اور کیفیات کو یاد نہ رکھ سکیں۔ وہ عاشق ہی کیا ہوا کہ جس کو محبوب کی بات یاد نہ رہے۔ صحابہ کرام تو محب اور عاشق صادق بھی تھے اور قوی الحافظہ بھی۔ محبت اور عظمت کے ہوتے ہوئے تو ضعیف الحافظہ بھی قوی الحافظہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جس کے ساتھ عظمت اور محبت کا تعلق ہو اور مزید برآں محبوب کے وہ ارشادات ہر وقت اس کے پیش نظر ہوں۔ ایک ترغیبی[۲] اور ایک ترہیبی[۳] تو حافظہ میں اور بھی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ ترغیبی ارشاد تو یہ ہے۔

نضر الله عبداً سمع مقالتی فحفظها ووعاها واداها کما سمعها[۴]

(اللہ تعالیٰ اس بندہ کو خوش رکھے جس نے میری بات کو سنا اور اچھی طرح یاد رکھا اور پھر جس طرح سنا تھا بعینہ اسی طرح بلاکم و کاست لوگوں تک پہنچایا) اور ترہیبی ارشاد یہ ہے۔

---

(۱) جلنا جلانا اور کپڑے چاک کرنا۔ پروانہ شمع اور گل نے مجھی سے سیکھا ہے۔

(۲) ترغیبی: ترغیب اور شوق دلانے والے

(۳) ترہیبی: ڈرانے والے

(۴) ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، (۲۳۰) ج ۱: ص ۸۴، باب من بلغ علما (۱۸) مقدمہ

من كذب علي متعمداً فليتبوأ مقعده من النار[1].

(جس نے کوئی غلط بات قصداً میری طرف منسوب کی وہ جہنم کو اپنا ٹھکانہ سمجھے)۔

حضرات صحابہ کرامؓ، جن کے عظمت اور محبت کے تعلق کا حال معلوم ہوچکا ہے کیا وہ اس ترغیبی اور ترہیبی حکم سننے کے بعد آپ کی روایت میں کسی قسم کا تغیر اور تبدل اور کوئی خلط ملط کر سکتے ہیں۔ حاشا و کلا ہر گز نہیں۔ حضرات صحابہ و تابعین نے دینی خدمت اور توشۂ آخرت سمجھ کر احادیث کو روایت کیا اور لوگوں تک پہنچایا۔ بھلا عقلاً یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ روایات حدیث میں اپنی رائے کو شریک کرکے جہنم میں اپنا ٹھکانا بناتے۔ لہذا اس تقریر سے آج کل کے روشن خیالوں کا یہ شبہ تو کافور ہوا کہ اتنے زمانہ تک بلا لکھے ہوئے احادیث کا بعینہ یاد رہنا محال اور خلاف فطرت ہے۔

جناب کا تو حال یہ ہے کہ اگر کلکٹر صاحب یا گورنر صاحب آپ کو اپنی ملاقات سے نواز دیں۔ اور دو چار باتیں آپ سے کرلیں تو آپ کو وہ باتیں مع الفاظ اور مع لب و لہجہ تمام عمر یاد رہتی ہیں۔ اور دوستوں میں بیٹھ کر نہایت لذت اور مسرت کے ساتھ فخریہ بیان کرتے ہیں۔ کہ کلکٹر صاحب نے مجھ سے یہ بات اس طرح فرمائی تھی۔ اور یہ بات اس طرح۔

سبحان اللہ کیا حضرات صحابہ کو نبی اکرم ﷺ سے اتنا بھی تعلق نہ تھا جتنا کہ آپ کو کلکٹر صاحب سے، آپ کو کلکٹر صاحب کے الفاظ کا بعینہ یاد رہنا نہ محال ہے اور نہ خلاف فطرت۔ اور حضرات صحابہ اور تابعین

---

(۱) بخاری، الجامع الصحیح (۱۱۰) ج ۱: ص ۵۲۔ باب اثم من کذب علی النبی ﷺ (۳۸) کتاب العلم

کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا بلفظہ یاد رہ جانا محال ہے اور خلاف فطرت ہے۔

حضرات صحابہ کا تو یہ عالم تھا کہ اگر حضور نے بطور عتاب بھی کوئی کلمہ فرمایا تو روایت کرتے وقت صحابہ اس لفظ کو بھی بطور لذت نقل کیا کرتے تھے حضور نے ایک مرتبہ یہ فرمایا وان رغم انف ابی ذر[1] یعنی جو میں کہہ رہا ہوں بات اسی طرح ہے اگرچہ ابوذر کی ناک خاک میں رگڑی جائے تو ابوذر جب اس حدیث کو روایت کرتے تو اس لفظ کو بھی خوب مزے لے لے کر نقل کرتے اور جو احادیث خاص خاص کیفیتوں کے ساتھ نقل کی جاتی ہیں اصطلاح محدثین میں ان کو مسلسلات کہتے ہیں مثلاً کسی صحابی نے حضور ﷺ سے کسی حدیث کو سب سے پہلے سنا تو یہ حدیث ان کے حق میں حدیث اول تھی تو انہوں نے حضور سے اس سننے کیفیت کو بھی محفوظ رکھا۔ اور جس کے سامنے اس حدیث کو روایت کیا سب سے پہلے اس کو یہی حدیث سنائی۔ اور یہ بھی بتایا کہ میں نے حضور ﷺ سے یہی حدیث سب سے پہلے سنی۔ ایسی حدیث کو مسلسل بالاولیۃ کہتے ہیں۔ کہ جو استاذ نے اپنے شیخ سے سب سے پہلے سنی ہو۔ سب سے پہلے اسی کو

---

(۱) امام بخاری نے اس حدیث کو نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جس شخص نے کلمہ لاالہ الا اللہ کہدیا اور پھر اسی پر اس کی موت واقع ہوگئی تو وہ جنت میں داخل ہوگیا: ابوذر فرماتے ہیں میں نے عرض کیا چاہے وہ زنا اور چوری کرے، آپ نے فرمایا چاہے وہ زنا اور چوری کرے، میں نے پھر عرض کیا کہ چاہے وہ زنا اور چوری کرے آپ ﷺ نے پھر فرمایا کہ چاہے وہ زنا اور چوری کرے میں نے تیسری مرتبہ پھر عرض کیا تو آپ نے فرمایا۔ وان زنیٰ و ان سرق علی رغم انف ابی ذر، امام بخاری فرماتے ہیں کہ ابوذر جب بھی اس حدیث کو روایت کرتے تو خود کہتے وان رغم انف ابی ذر۔ دیکھئے بخاری، الجامع الصحیح (۵۴۸۹) ج ۷: ص ۱۹۳ باب الثیاب البیض، کتاب اللباس۔

سنائے اور دیگر احادیث بعد میں سنائے۔ آج تک وہ حدیثیں روایت کی جاتی ہیں بعض حدیثیں ایسی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرماتے وقت تبسم فرمایا تھا۔ صحابہؓ کے وقت سے لے کر اس وقت تک وہ حدیثیں تبسم ہی کے ساتھ روایت کی جاتی ہیں کہ شیخ روایت کے وقت مسکراتا ہے۔ ایسی حدیث کو مسلسل بالضحک کہتے ہیں۔ یا مثلاً حضور نے ارشاد فرماتے وقت ران پر دست مبارک مارا ہے۔ وہ روایت آج تک اسی کیفیت کے ساتھ روایت کی جاتی ہے جس کو مسلسل بضرب الفخذ کہتے ہیں[1]۔

اس سے محبت اور عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ جو حضرات صحابہ کے دلوں میں تھی۔ پھر اسی محبت اور عظمت کا عکس تابعین کے دلوں پر پڑا اور اس کا عکس تبع تابعین پر پڑا، امام مالک[2]، لیث بن سعد[3] اور اوزاعی[4] وغیرہ وغیرہ یہ ائمہ حدیث تبع تابعین ہیں۔ جو صحابہ کرام کی محبت و عظمت کے وارث ہوئے، انہیں قرنوں میں حدیث کی تدوین مکمل ہوئی جو زمانہ خیریت کا تھا۔ یہ تائید غیبی تھی کہ شر اور فتنہ کے زمانہ

---

(۱) اس طرح کی مسلسل روایات کی تین قسمیں ہیں (۱) راویوں کی تسلسل کے ساتھ مشترک حالت ہو یا نام ایک ہوں، (۲) راویوں کی ایک جیسی یا الفاظ روایت کا تسلسل ہو مثلاً سب راوی اخبرنا سے روایت نقل کریں (۳) روایت کی کوئی ایسی مشترک حالت ہو جو تمام راوی عملاً نقل کریں جیسے تبسم کی مثال دی گئی۔ امام سیوطی نے اپنی کتاب المسلسلات الکبریٰ میں ۸۵ مسلسل روایات کو اور محمد عبدالباقی ایوبی نے اپنی کتاب المناهل السلسلة فی احادیث المسلسلة میں ۲۱۲ روایات جمع کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راویان حدیث نہ صرف الفاظ حدیث کی حفاظت کا اہتمام کرتے تھے بلکہ اس وقت اگر کوئی خاص کیفیت تھی، تو اس خاص کیفیت کو بھی محفوظ رکھا اور آگے نقل کیا۔

(۲) مالک بن انس: م ۱۷۹ھ

(۳) لیث بن سعد: م ۱۶۵ھ

(۴) اوزاعی، ابو عمرو عبدالرحمن بن عمرو الشامی: م ۱۵۷ھ

سے پہلے حدیث پوری مدون ہو گئی۔ علاوہ ازیں حضرات صحابہ و تابعین کا حافظہ نہایت قوی تھا اور حضور پر نور کے ساتھ ان کا قلبی تعلق انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ حق تعالیٰ کو اپنے دین کی حفاظت بھی مقصود تھی۔ اور تائید غیبی ان کی معین اور مددگار تھی۔ حافظہ اور تعلق قلبی تو حفظ کے ظاہری اسباب ہیں۔ اور ارادہ ازلیہ اور تائید غیبی حفظ کے باطنی اسباب ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس کام کے لیے ظاہری اسباب کے ساتھ باطنی اسباب جمع ہو جائیں تو اس کی رفتار کتنی تیز ہو گی۔

بالفرض والتقدیر اگر حافظہ بھی قوی نہ ہوتا اور تعلق قلبی بھی نہ ہوتا مگر ارادہ اور تائید غیبی ہوتی تو وہی کافی تھی۔ خدائے تعالیٰ اگر حفاظت چاہیں تو کون بھلا سکتا ہے۔ اور منجملہ اسباب باطنی کے آنحضرت ﷺ کی حاملین دین کے حق میں وہ دعائیں بھی ہیں جو احادیث میں مروی ہیں مثلاً نضر اللّٰہ امرا سمع مقالتی[1] نیز آنحضرت ﷺ کی دلی تمنا تھی کہ میری حدیثیں محفوظ ہوں۔ اللّٰہ تعالیٰ نے آپ کی تمنا اس طرح پوری فرمائی کہ آپ کے خدام کو ایسا حافظہ عطا فرمایا کہ ایک ہی مرتبہ سننے کے بعد ایسا نقش کالحجر ہو جائے کہ اگر بالفرض بھلانا بھی چاہیں تو نہ بھلا سکیں۔

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں ــــــ مے دہد یزداں مراد متقین[2]

---

(۱) ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ (۲۳۰) ج۱: ص ۸۴۔ باب من بلغ علماً (۱۸) مقدمہ، اس کے علاوہ نبی کریم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں پہلے لوگوں سے اس بات کا اقرار لیا کہ میں نے اللّٰہ کا پیغام تم کو پہنچا دیا، لوگوں کے اس اقرار پر اللّٰہ کو گواہ بنایا اور پھر ارشاد فرمایا کہ تم میں سے موجود ہیں وہ ان تک میرا پیغام پہنچا دیں جو اس وقت غائب ہیں اور صحابہ نے نبی کریم ﷺ کی اس ہدایت پر عمل کیا آپ کے ارشادات، افعال و سنن آئندہ نسلوں کو منتقل کیے۔

(۲) جیسا تم چاہو خدا بھی ویسا ہی چاہتا ہے (کیونکہ) خدا تعالیٰ متقین کی مراد پوری فرما دیتا ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو ہریرہؓ کے لیے حافظہ کی دعا کی اور ان کی چادر پر پڑھ کر کچھ دم کیا اور فرمایا کہ اس چادر کو اپنے سینہ سے لگالو جس کا یہ اثر ہوا کہ ابو ہریرہؓ کا حافظہ اتنا قوی ہو گیا کہ اس کے بعد ایک حرف بھی نہیں بھولے۔

حفظ قرآن کے لیے حدیثوں میں ایک نماز اور دعا بھی آتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس دعا کو پڑھ کر دو مہینہ میں پورا قرآن یاد کر لیا۔ یہ تائید غیبی نہیں تو کیا ہے، حفظ قرآن سراسر تائید غیبی ہے۔ دنیا میں سوائے قرآن کریم کے اور کس کتاب کے حافظ ہیں۔ توریت اور انجیل کا دنیا میں ایک بھی کوئی کچا اور پکا حافظ نہیں۔ یہ صرف قرآن کریم کا معجزہ ہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ[۱] بانی دارالعلوم دیوبند نے پورا قرآن ایک مہینہ میں یاد کیا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری[۲] شارح سنن ابی داؤد نے دو ماہ میں قرآن یاد کیا۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ[۳] کی مجلس میں ان دو بزرگوں کے قرآن کریم حفظ کرنے کا تذکرہ ہوا تو فرمایا کہ مولانا خلیل احمد صاحبؒ۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے نصف تھے اس لیے دو ماہ میں حفظ کیا اور تائید غیبی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ موانع کو اٹھا دیں۔ مثلاً دو شخص تجارت کرنا چاہتے ہیں اور دونوں دولت اور سرمایہ اور ترقی کے وسائل اور ذرائع کے اعتبار سے برابر ہیں۔ دونوں نے تجارت شروع کی

(۲۲) مولانا محمد قاسم نانوتوی: م ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء۔

(۲۳) مولانا خلیل احمد سہارنپوری: م

(۲۴) مولانا اشرف علی تھانویؒ: م ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء

ایک کے لیے من جانب اللہ ترقی کی راہ میں موانع پیش آئے، وہ پیچھے رہ گیا اور دوسرے کے لیے تمام موانع اٹھادیے گئے من جانب اللہ اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی، وہ تجارت میں ترقی کر گیا۔ اسی طرح نفس کا کسی دوسری طرف مشغول رہنا علم اور حفظ کے لیے مانع ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے صحابہ اور تابعین کے دلوں کو دنیا اور مافیہا سے پاک کردیا۔

نزه فؤادک عن سوانا وأتنا　　فجنابنا حل لکل منزه

(قلب کو ہمارے ماسوا سے پاک اور صاف کرلے اور پھر ہمارے پاس آ ہماری بارگاہ اسی کے لیے روا ہے جس کا قلب ہمارے ماسوا سے پاک ہو) صحابہ کرامؓ کے قلوب حضور پر نور کی نظر کیمیا اثر کی برکت سے ایسے پاک اور منزہ ہوئے کہ غیر اللہ کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ اب ان پاک و صاف الواح پر لکھا گیا، وہ پختہ ہوا کہ مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ جو ان کے دلوں میں ڈالا گیا وہ ایسا راسخ ہوا کہ بالفرض اگر نکالنا بھی چاہیں تو نکل نہیں سکتا۔

اتانی هوا ها قبل ان اعرف الهویٰ　　فصادف قلبا خالیا فتمکنا

(اس کی محبت ایسے وقت میں آئی کہ میں محبت کو پہنچانتا بھی نہ تھا محبت نے قلب کو خالی پایا، اور جا گزیں ہو گئی)۔

امام زہری[1] کا واقعہ ہے کہ جب مدینہ منورہ کے بازار میں گذرتے تو کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔ کسی نے عرض کیا کہ حضرت یہ کیا ہے کہ کان کے راستہ سے جو کچھ میرے قلب اور دماغ میں پہنچ جاتا ہے پھر وہ نکلتا نہیں اس لیے کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہوں کہ بازار کی

---

(۱) ابن شہاب زہری، ابوبکر محمد بن مسلم: م ۱۲۴ھ/

خرافات میرے کانوں میں داخل نہ ہو کہ پھر یہ خرافات نکلے گی نہیں[1]۔

خلاصہ کلام

یہ کہ کسی شے کی حفاظت کے جس قدر اسباب عقلاً ممکن ہیں، وہ سب حدیث نبوی میں جمع ہیں۔ قوت حافظہ، فراست کاملہ، عظمت و ہیبت، عشق اور محبت، دنیا سے نفرت اور بیزاری اور آخرت کی تیاری، اللہ تعالیٰ کا ارادہ ازلیہ، تائید غیبی اور حضور پر نور کی دلی تمنائیں، دعائیں، من جانب اللہ رفع موانع۔ فتلک عشرۃ کاملۃ. من جانب اللہ حدیث نبوی میں یہ تمام ظاہری اور باطنی اسباب جمع ہوگئے۔ اب اس کی محفوظیت اور حجیت میں کیا شبہ اور تردد ہوسکتا ہے[2]۔

دوسرا شبہہ

اکثر احادیث روایت بالمعنیٰ ہیں راوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں ادا کیا۔ جب حضور کے الفاظ ہی محفوظ نہیں تو قطعی طور پر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مفہوم محفوظ ہے لہذا حدیث حجت نہ ہوگی۔

---

(۱) زہری کے حافظہ کے متعلق امام ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ آپ نے ۸۰ راتوں میں مکمل قرآن کریم حفظ کرلیا تھا۔ دیکھئیے ذہبی، تذکرۃ الحفاظ (۹۷-۱۲۴/۴) ج۱: ص ۱۱۰

(۲) صحابہ کرام نے صرف حفظ و کتابت ہی نہیں، عمل سے بھی محفوظ کیا مزید یہ کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ صحابہ کے دور میں حدیث کی کتابت نہیں ہوئی عجاج الخطیب اور مصطفیٰ اعظمی کے مطابق صحابہ کے چھوٹے بڑے ۳۰ مجموعاتِ حدیث تحریری شکل میں موجود تھے۔ دیکھئے عجاج الخطیب، محمد، السنۃ قبل التدوین، قاہرہ، مکتبہ وہبہ، ص ۳۲۰

جواب

حدیث فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلمات طیبات ہی کا نام نہیں بلکہ آپ کے افعال و اقوال اور واقعات اور احوال جو آپ کے سامنے پیش آئے سب ہی کو حدیث کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ روایت باللفظ کی ضرورت صرف آپ کے کلمات طیبہ اور احادیث قولیہ تک محدود ہے، جو حدیث کا ایک قلیل حصہ ہے۔ اور آپ کے افعال و اعمال اور واقعات واحوال جو حدیث کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، اس میں روایت باللفظ کا سوال ہی جاری نہیں ہوسکتا اس لیے کہ ظاہر ہے کہ جو شخص بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی فعل اور حال کو نقل کرے گا، وہ اپنے ہی لفظوں میں کرے گا۔ کسی کے اقوال تو باللفظ نقل ہوسکتے ہیں مگر افعال اور احوال تو کوئی لفظ نہیں جن کو باللفظ نقل کیا جاسکے۔ بس آدمی اگر کسی کے فعل اور عمل کو بیان کریں گے تو بس ہی لفظوں میں روایت کریں گے۔ معلوم ہوا کہ حضور پر نور کے افعال اور احوال کی روایات اور حکایات میں روایت باللفظ کا سوال تو درکنار عقلی احتمال بھی نہیں جاری ہوسکتا۔ پھر احادیث قولیہ میں ایک بڑا ذخیرہ احادیث اذکار اور ادعیہ کا ہے، ان کے متعلق بھی بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ سب روایت باللفظ ہیں اس لیے کہ مسلمانوں میں قرناً بعد قرن اور نسلاً بعد نسل بالتواتر انہی الفاظ کے ساتھ نقل ہوتی آرہی ہیں۔

علیٰ ہذا۔ اذان، تشہد، اقامت، احادیث قدسیہ[1]، احادیث اخلاق،

---

(۱) احادیث قدسیہ: حدیث قدسی کی جمع ہے یعنی "وہ روایات جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہم تک اس طرح منقول ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ رب العزت سے منسوب کیا ہو"۔

احادیث جوامع الکلم[1] سب تقریباً باللفظ مروی ہیں اور احکام کلیہ کا اکثر و بیشتر حصہ بھی باللفظ مروی ہے۔ اب اس کے بعد روایت بالمعنیٰ کا جس قدر حصہ موجود ہے وہ بہت ہی قلیل ہے۔ اور زیادہ بلکہ تقریباً اکثر و بیشتر روایت باللفظ ہی کا ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ بسا اوقات ایک ہی بات کو مختلف اوقات میں مختلف تعبیرات سے بیان فرمایا، کسی راوی نے کوئی لفظ نقل کیا اور کسی نے کوئی لفظ نقل کیا۔ پھر تعجب ہے روایت بالمعنیٰ کے اس اقل قلیل[2] حصہ کے حکم کو کل ذخیرہ حدیث پر کیسے جاری کردیا۔ قاعدہ تو للاکثر حکم الکل[3] ہے مگر احادیث کے بارہ میں اس قاعدہ کو چھوڑ کر للاقل حکم الکل مان لیا گیا۔ دنیا کے تمام کاروبار اکثر و اغلب کے اعتبار سے چل رہے ہیں۔ مثلاً کھانا کھاتے ہیں۔ اس لیے کہ اکثر یہ ہے کہ ہضم ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی بد ہضمی ہوجاتی ہے۔ ریل اور جہاز میں سفر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اکثر بخیریت پہنچادیتے ہیں۔ اور کبھی ریل کی ٹکر بھی ہوجاتی ہے۔ اور جہاز غرق بھی ہوجاتا ہے، اگر حدیث میں اشتباہ تھا تو روایت بالمعنیٰ کی وجہ سے تھا۔ لہذا جتنا حصہ روایت بالمعنیٰ کا ثابت ہو،

---

(۱) آپ کے وہ ارشادات جن میں آپ نے ایک مختصر سے جملے یا جملہ کے ایک حصہ میں بہت سی حکمتیں جمع کردی ہوں جیسے انما الاعمال بالنیات۔ اس قسم کی احادیث کی تعداد امام نووی کے مطابق ۴۰ یا ۴۲ ہے اور ابن رجب حنبلی کے نزدیک ۵۰ ہے امام نووی نے "الاربعین" کے نام سے ان احادیث کو جمع کیا ہے ان کی تشریح کی ہے جبکہ ابن رجب حنبلی نے "جامع العلوم والحکم" کے نام سے عمدہ شرح کے ساتھ ۵۰ حدیثوں کو جمع کیا ہے۔

(۲) اقل قلیل: بہت ہی کم

(۳) اکثریت کے مطابق سب پر حکم لگایا جاتا ہے۔

آپ کے قاعدہ کی بناء پر صرف اتنا ہی حصہ مشتبہ رہنا چاہیئے۔ تمام ذخیرہ حدیث کو کیسے مشتبہ قرار دے دیا حالانکہ وہ بھی مشتبہ نہیں۔ اس لیے کہ روایت بالمعنیٰ وہی مقبول ہے کہ جس کا راوی الفاظ کے مدلول، مفہوم، معانی اور مقاصد کو خوب سمجھتا ہو اور یہ بھی خوب جانتا ہو کہ اگر اس لفظ کے بجائے دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو مفہوم میں کتنا تغیر[۱] ہو جائے گا اور جو راوی ان باتوں کو جانتا اور سمجھتا نہ ہو، اس کی روایت بالمعنیٰ بالاتفاق مقبول نہیں خصوصاً وہ روایت بالمعنیٰ جو مختلف راویوں سے مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہو وہاں چند روایات کے ملانے سے پتہ چل جاتا ہے کہ اصل مضمون کیا ہے۔ ایسی صورت میں کیا اشتباہ رہ سکتا ہے۔ عدالت میں اگر متعدد گواہ ایک واقعہ قولیہ یا فعلیہ کے متعلق بالفاظ مختلفہ شہادت دیں تو ان سے اصلی حقیقت خوب واضح ہو جاتی ہے بلکہ بعض مرتبہ گواہوں کے متفق اللفظ ہونے سے شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ سکھائے ہوئے تو نہیں۔ اور اگر بالفرض والتقدیر تسلیم کر لیا جائے کہ حدیث کے الفاظ محفوظ نہیں، صحابی نے اپنے ہی الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کے مقصود کو ادا کیا ہے تب بھی حجت ہوگا۔ اس لیے کہ صحابۂ کرام اعلیٰ درجہ کے عاقل، دانا اور قوی الحافظ ہونے کے علاوہ زبان داں بھی تھے، مزاج شناس بھی تھے، قرائن مقالیہ اور حالیہ[۲] سے بھی باخبر تھے، آپ کی مراد میں کسی تغیر و تبدل اور آپ کے کلام میں ادنیٰ تحریف کو اپنے لیے شقاوت سمجھتے تھے۔ لہذا ان

---

(۱) تغیر: تبدیلی

(۲) کسی قول کے سیاق و سباق کے قرائن یا ان احوال و کیفیات کے قرائن جن میں وہ بات کہی گئی۔

حضرات نے جو آپ کی مراد سمجھ کر اپنے الفاظ میں بیان کی، وہ بالکل مستند، معتبر اور تمام عالم کے لیے حجت ہوگی۔ اور اگر یہ کہاجائے کہ روایت بالمعنیٰ سے متکلم کا مقصد ادا نہیں ہوتا تو ہم یہ کہیں گے کہ پھر دنیا میں یہ تراجم کا سلسلہ بے کار ہے ترجمہ کی حقیقت ہی یہ ہے مترجم متکلم کے الفاظ کو تو چھوڑ دے اوراس کے معنیٰ اور مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کرے حالانکہ دنیا کا تجربہ شاہد ہے کہ علوم میں جو ترقی اور وسعت ہوئی، اس کا ایک بڑا ذریعہ تراجم ہیں۔ نیز اگر روایت بالمعنیٰ کو غیر مفید اور غیر معتبر قرار دیا جائے تو دنیا کے کارو بار معطل ہوجائیں ایک دوسرے کا پیغام اپنے ہی الفاظ پہنچاتا ہے۔ اگر دنیاوی کاروبار کے سلسلہ میں روایت باللفظ کو شرط قرار دیدیا جائے تو ایک منٹ کے لیے عالم کا کارخانہ نہیں چل سکتا۔ البتہ اگر یہ کہاجائے کہ روایت بالمعنیٰ بہ نسبت روایت باللفظ کے وثاقت اور طمانینت میں کم درجہ رکھتی ہے تو ہم کواس سے انکار نہیں غایتہ مافی الباب[1] وہ علم ظنی کی مفید ہوگی نہ کہ علم قطعی کی۔ سو فقہاء اس کے قائل ہیں پھر تعجب ہے کہ اس قسم کے احتمالات اور شبہات تاریخ میں نہیں نکالتے حالانکہ وہاں نہ سند کا پتہ ہے نہ روایت باللفظ کا نام و نشان ہے کہیں شاذو نادر کوئی روایت باللفظ مل جائے ورنہ اکثر و بیشتر سب جگہ روایت بالمعنیٰ ہی ملے گی۔

تیسرا شبہہ

احادیث مختلف اور متعارض[2] ہیں۔ لہذا متعارض اور

---

(۱) غایت مافی الباب: زیادہ سے زیادہ

(۲) متعارض: ایک دوسرے کے خلاف

متناقص(۱)شئے کیسے حجت ہو سکتی ہے۔ حسب قاعدہ "اذا تعارضا تساقطا". (جب دو چیزیں متعارض ہوں تو دونوں ساقط الاعتبار ہوں گی) احادیث بھی تعارض کی وجہ سے ساقط الاعتبار ہوں گی۔

جواب

یہ تعارض اور اختلاف تو تاریخی واقعات میں بھی ہے اور بہت ہے، حدیث میں تو بہت ہی کم ہے۔ احادیث صفات میں تو کہیں تعارض نہیں احادیث اخلاق و رقاق[۲] میں بھی تعارض نہیں احادیث معجزات میں بھی کہیں تعارض نہیں احوال جنت و جہنم کے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں تعارض نہیں والنادر کالمعدوم[۳]۔ البتہ احادیث احکام میں بعض احادیث متعارض ہیں۔ اور وہ اس قدر قلیل ہیں کہ ان کو غیر متعارض احادیث سے وہ نسبت بھی نہیں جو ایک کو ہزار سے ہو لہذا چند احادیث متعارضہ کو سامنے رکھ کر کل ذخیرۂ حدیث کو غیر معتبر قرار دینا کون سی دانائی ہے۔ غرض یہ کہ اگر اختلاف کی وجہ سے حدیث کو چھوڑنا ہے تو پہلے تاریخ کو چھوڑنا چاہیئے۔ معلوم ہوا کہ اختلاف سبب ترک کا نہیں۔ بلکہ طریقہ یہ ہے کہ حتی الوسع اختلاف کو رفع کیا جائے۔ اور مثلاً اسباب معیشت کے اختلاف کو اختلاف حالات پر محمول کیا جائے۔ اور اگر اختلاف رفع نہ ہوسکے تو راجح اور احوط[۴] پر عمل کیا جائے۔ یہ طریقہ عقل سلیم

---

(۱) متناقض: ایک دوسرے کے الٹ

(۲) رقاق: شفقت، محبت، نرمی، حسن اخلاق

(۳) بہت کم چیز نہ ہونے کے حکم میں ہوتی ہے

(۴) احوط: جس میں زیادہ احتیاط ہو

کے مطابق ہے۔

احادیث متعارضہ کا وہی حکم ہے جو آیات قرآن کے تعارض کا ہے کہ اگر تاریخ کا تقدم و تاخر معلوم ہوجائے تو ناسخ و منسوخ کہیں گے ورنہ کسی ایک کو ترجیح دیں گے۔ اور پھر وہ تعارض بھی فقط ظاہر نظر میں ہوتا ہے۔ غور و فکر کرنے سے بسا اوقات حل ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے اعمال و افعال کی تشریح دفعتہً نہیں ہوئی بلکہ بتدریج ہوئی مثلاً نماز ابتداء میں دو رکعت فرض ہوئی بعد میں چار ہوئی۔ نیز ابتداء اسلام میں دو ہی وقت کی نماز فرض تھی۔ صبح اور عصر بعد میں پانچ نمازیں فرض ہوئی اس قسم کے اختلافات کو تعارض اور تناقض کہنا غلطی ہے۔ یہ اس علم اور عبادت کی تکمیل کے مراحل اور مدارج ہیں جیسے درخت کو کسی نے پودہ کی حالت میں دیکھا اور کسی نے پھلوں سے لدا ہوا دیکھا وغیر ذلک۔ اور اس قسم کا اختلاف احکام قرآنیہ میں بھی موجود ہے مثلاً شراب اور میراث کے احکام میں جو بتدریج مشروع ہوئے۔

چوتھا شبہ

بہت سی حدیثیں موضوع ہیں اور صحیح اور غیر صحیح اس قدر مخلوط ہیں کہ ان میں امتیاز دشوار ہے۔ لہذا تمام حدیثیں قابل اعتبار نہ رہیں۔

جواب

بعض حدیثوں کے موضوع ہونے سے یہ کہاں لازم آیا کہ کل ذخیرۂ حدیث موضوع اور ناقابل اعتبار بن جائے۔ بعض کا حکم کل کو کیسے دے دیا گیا۔ کیا ایک دو فرد کے جھوٹا ہونے سے تمام اہل شہر پر یہ حکم

لگادینا کہ اس شہر کے تمام آدمی جھوٹے ہیں، صحیح ہوسکتا ہے وہ کونسا شہر ہے کہ جس میں کوئی جھوٹ بولنے والا نہیں۔ لہذا کسی شہر کے کسی آدمی کی کوئی روایت معتبر نہ ہونی چاہئیے۔ ہر زمانہ میں صدق کے ساتھ کذب کا سلسلہ بھی رہا ہے مگر اہل فہم اور اہل نظر ہمیشہ صدق اور کذب کا فرق سمجھتے رہے ہیں۔ اور صادق اور کاذب کبھی ان کی نظر میں ملتبس اور مشتبہ نہیں ہوئے۔ اور اگر بالفرض والتقدیر صادق اور کاذب کا امتیاز دنیا میں ناممکن ہوجائے تو کارخانہ عالم معطل ہوجائے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ جھوٹوں کی بہت کثرت ہے۔ پس جس طرح دنیوی امور میں حق اور باطل، صادق اور کاذب کا امتیاز ممکن ہے، اسی طرح دینی امور میں بھی صادق اور کاذب، حق اور باطل کا امتیاز ممکن ہے۔ پولیس والے ایک نظر میں چور کو تاڑ لیتے ہیں اور جن کو چور کی شناخت نہیں ان کے دل میں کبھی یہ خطرہ نہیں گذرتا کہ سارا شہر چور ہے۔ اسی طرح حضرات محدثین خداداد نور فہم اور نور تقویٰ سے ایک نظر میں پہچان لیتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا موضوع اور بالہام خداوندی اور بتائید ایزدی حضرات محدثین نے صحیح اور غیر صحیح کے پہچاننے کے لیے قواعد بنائے اور اس فن کو انتہائی کمال تک پہنچایا۔ علم اسماء الرجال[1] اور علم جرح و تعدیل[2] مدون کیا۔ تحقیق

---

(۱) علم اسماء الرجال علوم حدیث میں ایک ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس علم میں حدیث نقل کرنے والے راویوں کے سوانح پر بحث ہوتی ہے اور راویوں کو مختلف طبقات اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ دیکھیے، ابوزہو، الحدیث والمحدثون: ص ۴۵۴

(۲) کسی راوی کو عادل قرار دینے کو تعدیل اور کسی پر عدل و انصاف کے ساتھ طعن و اعتراض کرنے کو جرح کہا جاتا ہے راویوں کے احوال کے بیان پر مشتمل اس علم کو علم جرح و تعدیل کہا جاتا ہے۔

و تفتیش کر کے یہ بتلا دیا کہ فلاں اور فلاں ثقہ ہے۔ فلاں، فلاں اور فلاں کذاب ہے۔ اس کی کوئی روایت قبول نہ کی جائے صحیح اور حسن[1] کو الگ کردیا۔ موصول[2] اور مرسل[3] کو جدا کردیا۔ موضوعات کو الگ کردیا اور معتبرات کو علیحدہ کردیا اور ہر روایت کی سند بتلادی۔ راویوں کا نام، پتہ اور حال بتلادیا۔ اس سے زائد اور کیا بتلایا جاسکتا ہے۔ اس سے زائد اگر کچھ بتلایا جا سکتا ہے تو بتلایا جائے۔ دیکھیں تو سہی کیا بتلایئے گا اور کیا لایئے گا۔ دنیا میں اگر واضعین حدیث[4] ہوئے تو کیا پرواہ۔ الحمدللہ علم اسماء الرجال کی کسوٹی موجود ہے جس سے کھری اور کھوٹی حدیثوں کا امتیاز ہوسکتا ہے۔ جعلی سکہ چلانے والے اگر موجود ہیں تو صراف بھی موجود ہیں اور جو صراف نہیں اور کھرے کھوٹے کو نہیں سمجھتا اس کو چاہیئے کہ صراف کی طرف رجوع کرے۔

پھر لطف یہ ہے کہ ان منکرین حدیث کو تاریخ کے بارہ میں یہ شبہ پیدا نہیں ہوتا۔ کیا تاریخ میں کوئی موضوع اور غلط روایت نہیں۔ حالانکہ تاریخ میں کسی تاریخی واقعہ کی کوئی سند نہیں اور حدیث میں ہر روایت کی ایک سند نہیں دس دس، بیس بیس اور پچاس پچاس سندیں موجود ہیں۔

---

(۱) صحیح: ایسی خبر جس کی سند از ابتداء تا انتہاء ایسے لوگوں سے متصلاً منقول ہو جو عادل بھی ہوں اور جن کا حافظہ بھی ٹھیک ہو اور یہ خبر شذوذ و علت سے بھی پاک ہو حسن: اگر راوی کے قوت حافظہ میں فرق باقی تمام شرائط صحیح کی موجود ہوں تو وہ روایت حسن ہوگی۔

(۲) جس روایت کی سند مکمل ہو اسے موصول یا متصل کہتے ہیں۔

(۳) مرسل: کوئی تابعی صحابی کا نام لیئے بغیر براہ راست نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرے۔

(۴) واضعین حدیث: حدیث وضع کرنے والے (گھڑنے والے)

امتیازات حدیث

نیز حدیث کے لیے بالاجماع یہ شرط ہے کہ سلسلہ سند کے ہر راوی میں صفات ذیل موجود ہوں۔

۱۔ صادق ہو۔ یعنی راوی سچا ہو۔ کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو

۲۔ صحیح الفہم ہو۔ غبی، بد عقل اور بد فہم نہ ہو۔ حدیث کے سمجھنے میں غلطی نہ کرتا ہو۔

۳۔ صحیح الحافظہ ہو۔ یعنی نسیان اور وہم کا غلبہ نہ ہو

۴۔ ثقہ اور متقی ہو۔ یعنی فاسق و فاجر اور بد کار نہ ہو۔

۵۔ محتاط ہو۔ یعنی روایت میں سہل انگاری سے کام نہ لیتا ہو

۶۔ جعلی حدیث بنانے کی اس پر کوئی تہمت اور شبہ بھی نہ ہو

۷۔ معروف ہو مجہول نہ ہو۔ یعنی اہل علم اور اہل تقویٰ اس کے نام، نسب، کردار، اس کے علم، حفظ اور ثقاہت سے واقف ہوں۔ اور ان کی نظر میں اس کی رفتار و گفتار اور حال و کردار قابل اعتراض نہ ہو۔

۸۔ روایت میں کسی قسم کا اختلاف اور تعارض نہ ہو

۹۔ سلسلۂ سند اول سے آخر تک متصل ہو یعنی درمیان میں سے کوئی راوی رہ نہ گیا ہو۔

۱۰۔ سلسلۂ سند جس شخص پر منتہی ہو[1] اس کے لیے یہ شرط ہے کہ جس امر کو وہ روایت کر رہا ہو بذات خود اس واقعہ میں شریک رہا ہو۔ قول ہو تو کانوں سے سنا ہو۔ فعل ہو تو آنکھوں سے دیکھا ہو۔ یہ دس شرائط

---

(۱) منتہی ہو: ختم ہو

ہیں۔ فتلک عشرۃ کاملہ۔ جن کے بغیر حضرات محدثین کے یہاں روایت مقبول اور معتبر نہیں۔ یہ علم حدیث کا خاص امتیاز ہے اور اسلام کی خاص خصوصیت ہے جس میں دنیا کی کوئی قوم ان کی شریک اور سہیم نہیں۔

تاریخی کتابیں جو نصاب تعلیم کا جزء اعظم بنی ہوئی ہیں کیا ان میں جو واقعات درج ہیں وہ اس معیار پر اتر سکتے ہیں، ہر گز نہیں آج کل یورپ میں جو فلسفہ تاریخ رائج ہے۔ اس میں راوی کا سچا ہونا بھی شرط نہیں۔ بقیہ اوصاف فاضلہ اور صفات کاملہ کا ذکر ہی کیا۔ فلسفۂ تاریخ کا مسئلہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص جھوٹ بولتا ہو اس کی کوئی بات نہ مانی جائے۔ اس لیے کہ جھوٹے کی ہر بات کا جھوٹا ہونا ضروری نہیں۔ حضرات محدثین بھی اس راز سے واقف تھے عرب کی مشہور مثل ہے الکذوب قد یصدق جھوٹا بھی کبھی سچ بول دیتا ہے مگر باوجود اس کے حضرات محدثین نے یہ قاعدہ مقرر فرمایا کہ جس شخص کا مدت العمر میں ایک مرتبہ بھی جھوٹ ثابت ہوجائے اس کی کوئی روایت معتبر نہیں۔ خدا کی قسم یہ احتیاط کی انتہا ہے۔ عقل اس سے زیادہ تصور کرنے سے قاصر ہے نیز تاریخ میں صحیح اور غیر صحیح کا کوئی معیار نہیں۔ غرض یہ کہ تاریخ کو حدیث سے کوئی نسبت نہیں۔ ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ لیکن تعجب ہے کہ منکرین حدیث کے نزدیک تاریخ تو حجت اور معتبر ہوجائے اور نصاب تعلیم کا جزو بن جائے جہاں نہ کوئی سند ہے، نہ راوی کی صداقت و امانت شرط ہے اور نہ صحیح اور غیر صحیح کا کوئی معیار ہے۔ حدیث غیر معتبر ہوجائے۔ جہاں ہر لفظ کی سند موجود ہے، صحیح اور سقیم سب الگ الگ ہے۔ اور الگ کرنے کا معیار بھی موجود ہے اگر موضوع حدیثوں کی وجہ سے مطلقاً حدیث کا انکار

جائز ہے تو تاریخ میں حدیث سے ہزار درجہ بڑھ کر موضوع روایتیں موجود ہیں بلکہ تاریخ میں تو صدہا بلکہ ہزارہا واقعات سیاسی مصالح کی بنا پر دیدہ و دانستہ وضع کر کے شامل کئے گئے ہیں۔ خصوصاً یورپ کی تاریخیں تو بکثرت سیاسی مصالح کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ اس لیے علم تاریخ کا بھی سرے ہی سے انکار کر دینا چاہیئے"[1]۔

خلاصہ

یہ کہ حضرات محدثین نے قبول روایت کی جو شرائط بیان کی ہیں، وہ دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں پائے جاتے۔ پس اگر حدیث معتبر نہ ہو تو دنیا کی تاریخ معتبر نہیں ہو سکتی۔ قبول روایت کی شرائط کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اب ہم معیار تنقید بیان کرتے ہیں۔

معیار تنقید

(یعنی صحیح اور غیر صحیح، موضوع اور غیر موضوع کا امتیاز کس طرح ہو) حضرات محدثین نے اس کے لیے دو معیار بتلائے ہیں۔ ایک برہانی اور ایک وجدانی۔

معیار برہانی

برہانی معیار یہ ہے کہ جس حدیث میں امور ذیل میں سے کوئی امر پایا جائے وہ اس حدیث کے موضوع ہونے کی علامت ہے۔

---

(۱) روایات تاریخ کو جانچنے کی لیے مورخین نے جو معیارات قائم کیے ہیں علم حدیث میں نقل روایات کے لیے شرائط کا ان سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ تاریخ کے لیے اعلیٰ ترین معیار، حدیث کے ادنیٰ ترین معیار کے برابر بھی نہ ہو گا۔

۱۔ نص قرآنی کے مخالف ہو
۲۔ سنت متواترہ کے خلاف ہو
۳۔ اجماع قطعی یعنی اجماع صحابہ و تابعین کے خلاف ہو اور توجیہ تاویل کی اس میں گنجائش نہ ہو
۴۔ عقل سلیم کے خلاف ہو۔ یعنی عقول سلیمہ اس کو عقلاً محال سمجھتی ہوں۔ اعتبار عقل سلیم کا ہے عقل سقیم کا اعتبار نہیں۔
۵۔ شریعت کے قواعد کلیہ اور مسلمہ کے خلاف ہو
۶۔ سلسلہ سند میں کوئی ایک راوی بھی ایسا ہو کہ جس کا ایک مرتبہ بھی مدت العمر میں جھوٹ ثابت ہو گیا۔ اس کی کوئی روایت بھی باجماع محدثین معتبر نہیں۔
۷۔ راوی رافضی ہو اور صحابہ کے مطاعن کے متعلق کوئی روایت کرے یا راوی خارجی ہو اور اہل بیت کے مطاعن کے بارہ میں کوئی روایت کرے۔

تنبیہ

حضرات محدثین کا عمل یہ ہے کہ تنہا رافضی کی کوئی روایت نہیں لیتے۔ اس لیے کہ روافض کے نزدیک تقیہ جزو ایمان ہے۔ اور اہل عقل کے نزدیک تقیہ جھوٹ کا ایک مہذب عنوان ہے۔ اور خوارج کی روایت لے لیتے ہیں۔ اس لیے کہ خوارج کے نزدیک جھوٹ بولنا کفر ہے۔ اور روایت کا اصل دارومدار صداقت پر ہے۔ اس لیے حضرات محدثین خوارج کی روایت تو لے لیتے ہیں اور روافض کی روایت نہیں لیتے۔ مگر اہل بیت کے بارہ میں خوارج کی روایت قبول نہیں کرتے۔

٨۔ قرینۂ حال اس کے کذب پر شاہد ہو مثلاً بادشاہ کے دربار میں بادشاہ کی خوشنودی کے لیے برجستہ کوئی حدیث بیان کرے۔

٩۔ اس روایت کا مضمون ایسا ہو کہ جس کا جاننا تمام مکلفین پر فرض ہو۔ اور نہ جاننے کے لیے کوئی عذر بھی نہ ہو۔ مگر بایں ہمہ اس کا روایت کرنے والا سوائے اس کے اور کوئی نہ ہو۔

١٠۔ جس زمانہ کا واقعہ بیان کرے وہ تاریخی شہادت کے صریح خلاف ہو مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ کا جنگ صفین میں شریک ہونا بیان کرے جو صریح کذب ہے۔ اس لیے کہ عبداللہ بن مسعودؓ خلافت عثمانیہ کے زمانہ میں وفات پاچکے ہیں۔ اور جنگ صفین اس کے بعد ہوئی۔

١١۔ حدیث کے الفاظ یا معانی ایسے رکیک ہوں کہ قواعد عربیت کے مطابق نہ ہوں یا شان نبوت و رسالت کے مناسب نہ ہوں۔

١٢۔ معمولی کام پر غیر معمولی ثواب اور اجر کا وعدہ ہو یا معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

١٣۔ حدیث کسی ایک ایسے محسوس اور مشاہد واقعہ کے بیان پر مشتمل ہو کہ اگر وہ وقوع میں آتا تو ہزاروں اس کے روایت کرنے والے ہوتے۔ مگر بایں ہمہ سوائے اس ایک راوی کے اور کوئی روایت کرنے والا نہیں۔

١٤۔ اس واقعہ میں شریک ہونے والے اس کے خلاف اس قدر کثرت سے روایت کریں۔ کہ عقلاً ان کا جھوٹ پر اتفاق کرلینا ممکن نہ ہو۔

١٥۔ واضع حدیث خود حدیث کے وضع کا اقرار کرے جیسا کہ نوح بن عصمہ نے اقرار کیا کہ میں نے ایک ایک سورت کی فضیلت میں حدیثیں وضع کی ہیں۔

جس حدیث میں ان پندرہ باتوں میں سے کوئی بات پائی جائے گی وہ حدیث موضوع سمجھی جائے گی۔

اب معترضین بتلائیں کہ کیا ان تصریحات و تنقیحات کے بعد حدیث کی صحت کا معیار واضح نہیں ہوجاتا اور کیا اس بے نظیر اور بے مثال معیار کے ہوتے ہوئے بھی وضع حدیث کا اندیشہ اور خطرہ دامن گیر ہے۔

حضرات محدثین نے صحت اور تنقید کا معیار بھی بتلادیا۔ اور موضوعات پر علیحدہ کتابیں بھی لکھ دیں جن میں خوب واضح طور پر یہ بتلادیا کہ یہ حدیثیں جعلی ہیں۔ ان کو کوئی اصلی حدیث نہ سمجھ جائے۔ اور جس حدیث پر بھی کلام کیا اولاً اس کی سند بتلائی۔ پھر اس کے راویوں کے صدق و کذب، ان کے ثقہ اور غیر ثقہ اور ان کے حافظہ کی قوت و ضعف پر بحث کرکے حدیث پر حکم لگایا۔ بے دلیل کوئی حکم نہیں لگایا اور اگر اس حدیث کے موضوع اور غیر موضوع ہونے میں علماء کا اختلاف ہوا تو وہ تمام اختلاف تمہارے سامنے رکھ دیا کہ تم خود بھی دیکھ لو اور سمجھ لو اس معیار پر جانچ لو پرکھ لو کہ کھرا کھوٹا سب معلوم ہوجائے گا۔

شناسندہ گر نیست شوریدہ مغز　　نہ بہرہ شناسد زدینار نغز

حدیث از معائب بود گر تہی　　درخشندہ می باشد از فرہی

از و تا بد انوار پیغمبری　　چو نور از مہ و تابش از مشتری[1]

---

(۱)　۱۔ اگر پراگندہ ذہن کا آدمی پہچاننے پر قادر نہیں ہے تو بسا اوقات چست و چلاک بھی دینار سے اپنا مقدر، نہیں پہچان سکتا تو بہرہ قوم کا آدمی دینار کی عمدگی کو پہچان ہی نہیں سکتا

حدیث اگر عیوب سے خالی ہو تو اپنی شان و شوکت کی بنا پر روشن و چمک دار ہوتی ہے

اس سے انوار پیغمبری چمکتے اور روشن ہوتے ہیں جیسے چاند سے نور اور مشتری ستارے سے شعاعیں روشن ہوتی ہیں

منکرین حدیث بتلائیں

کہ حضرات محدثین نے تنقید حدیث کا جو معیار بتلایا ہے کیا اس سے بہتر کوئی معیار ہوسکتا ہے۔ جو لوگ اس معیار کو ناکافی سمجھتے ہیں وہ اس کو چھوڑ کر کوئی اور شافی اور کافی معیار بتلائیں اور پھر اس معیار کا حضرات محدثین کے معیار سے موازنہ کریں۔

نیز یہ بتلائیں کہ حضرات محدثین نے جس بے مثال طریقہ سے احادیث نبویہ کی تحقیق و تنقیح کی ہے۔ دنیا کی کسی تاریخ میں کوئی اس کی نظیر ہے۔ نظیر کیا عشر عشیر بھی نہیں۔ اگر ہے تو دکھلائیں حضرات محدثین کے کمال تحقیق سے آج کتب حدیث بحمدللہ صحت اور وثاقت[1] کے اس بلند مقام پر ہیں کہ جو یہود اور نصاریٰ اور مجوس کی کتب مقدسہ کو بھی حاصل نہیں بلکہ دنیا کی کسی معتبر سے معتبر اور مستند تاریخ کو بھی حاصل نہیں۔

حضرات محدثین نے روایت اور درایت[2] تحقیق اور تنقید کے جو اصول قائم فرمائے، عقل سلیم ان سے کبھی انحراف نہیں کرسکتی۔ یہ وہ اصول اور قواعد ہیں کہ اس قسم کے اصول کبھی دنیا کے خواب و خیال میں بھی نہیں گذرے اور نہ ان سے بہتر اصول اور قواعد مرتب ہوسکتے ہیں۔ اور نہ ان اصول اور قواعد کی روشنی میں صحیح اور غیر صحیح، معتبر اور غیر معتبر میں اشتباہ اور التباس رہ سکتا ہے جس طرح محدثین نے تحقیق روایت کے لیے اصول اور ضوابط مقرر کیے، اسی طرح حضرات فقہاء نے استنباط[3]

---

(۱) وثاقت: قابل اعتبار ہونا (۲) درایت: احوالِ روایت سے روایت کی تحقیق

(۳) استنباط: قرآن کریم کی آیات اور نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ کے الفاظ و معانی سے عملی زندگی کے لیے مسائل نکالنا۔

اور استخراج[1] احکام کے اصول اور قواعد مقرر فرمائے۔ دونوں اصول اپنی اپنی نوعیت میں ایسے بے مثال اور بے نظیر ہیں کہ اولین اور آخرین میں نہ اصول حدیث کا کوئی جواب ہے اور نہ اصول فقہ کا کوئی جواب ہے۔ علم اصول حدیث اور علم اصول فقہ حضرات محدثین اور فقہاء کی علمی کرامت ہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا معجزہ ہے کہ حضور پر نور کے اتباع کی برکت سے یہ بے مثال علم عطا ہوا ورنہ یہود اور نصاریٰ میں کوئی ابو حنیفہ اور مالک، کوئی بخاری اور مسلم نہ ہوا۔

اگر مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب میں کسی جن اور انس کو اپنی عقل اور دانش، علم اور فہم پر ناز ہے تو اصول حدیث اور اصول فقہ میں کوئی کتاب لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کرے جو حضرات محدثین اور فقہا کے اصول حدیث اور اصول فقہ سے بہتر ہو۔ اور اگر نہیں پیش کرسکتا (اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک ہرگز نہیں پیش کرسکے گا) تو پھر حضرات محدثین اور فقہا کے تمسخر سے اپنی زبان اور قلم کو روکنا چاہئیے۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد ورنہ داری گرد بد خوئی مگرد[2]

جس طرح ادب حق تعالیٰ کی نعمت ہے اسی طرح گستاخی اور بدزبانی اللہ کا قہر اور عذاب ہے۔

از خدا جوئیم توفیق ادب بے ادب محروم ماند از فضل رب

بے ادب خود را نہ تنہا کرد بد بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد[3]

---

(۱) استخراج: آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے الفاظ سے لطیف معانی کا استخراج۔

(۲) ناز کے لیے چہرہ درکار ہے۔ گلاب جیسا اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو بد خوئی بھی نہ اختیار کر۔

(۳) اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق مانگتے ہیں کیونکہ بے ادب آدمی فضل ربی سے محروم رہتا ہے بے ادب نے صرف اپنے آپ کو برا نہیں بنایا بلکہ پورے جہاں میں برائی کی آگ جلادی۔

منکرین حدیث کا منشا ہی یہ ہے کہ نہ اصول تفسیر ہوں اور نہ اصول حدیث۔ اپنی رائے سے جو چاہیں قرآن کے معنیٰ بیان کریں اور جس حدیث کو چاہیں قبول کریں جس کو چاہیں رد کردیں۔ یہ اصول اور قواعد ہماری آزادی میں مخل اور مزاحم ہیں۔ ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا وهب لنا من لدنک رحمة انک انت الوهاب[۱]۔

معیار وجدانی

صحیح اور غیر صحیح کی معرفت کا وجدانی معیار یہ ہے کہ خدا داد نور فہم، نور فراست اور نور تقویٰ و معرفت سے حدیث کے سنتے ہی یہ معلوم کرے کہ یہ قول رسول ہے یا کسی اور کا قول ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کی جس پر عنایت ہوتی ہے، اس کو ایسا خاص فہم عطا فرماتے ہیں کہ جس سے وہ حق اور باطل، صدق اور کذب، ہدایت و ضلالت میں فرق کرسکے۔ ولقد آتينا لقمان الحكمة[۲]۔ (تحقیق ہم نے لقمان کو حکمت دی) اس حکمت سے وہی نور فہم مراد ہے جس سے حق اور باطل، صدق و کذب کا فرق آنکھوں سے نظر آنے لگے۔

حافظ ابن قیمؒ سے سوال کیا گیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ بغیر سند کے دیکھے ہوئے حدیث موضوع کا علم ہوجائے۔ حافظ ابن قیمؒ نے فرمایا کہ یہ بڑا عظیم القدر سوال ہے۔ بغیر سند کے دیکھے ہوئے وہی شخص حدیث کو پہچان سکتا ہے کہ جس کے گوشت اور پوست میں حدیث سرایت کرچکی

---

(۱) اے ہمارے پروردگار ہدایت سے نوازنے کے بعد ہمارے قلوب میں کھوٹ نہ پیدا فرما اور اپنی خاص رحمتیں ہمیں عطا فرما بلاشبہ تو خوب دینے والا ہے۔ القرآن: ۳: آل عمران: ۸

(۲) ۳۱: لقمان: ۱۲

ہو اور حضور کے اخلاق و عادات، اوامر و نواہی، آپ کے محبوبات اور مرضیات ہر وقت اس کی نظروں کی سامنے ہوں۔ گویا کہ وہ حضور پر نور کی مجلس مبارک میں صحابہ کرام کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ ایسا شخص حدیث کو سنتے ہی بغیر سند کے دیکھے ہوئے سمجھ جاتا ہے کہ یہ ارشاد نبوی ہے یا نہیں۔ یہ ایسا ہے کہ جیسا فقہاء حنفیہ یا فقہا شافعیہ طرز کلام ہی سے پہچان لیتے ہیں۔ کہ یہ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے یا امام شافعیؒ کا[۱]۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم[۲]

قد روی الخطیب عن الربیع بن خثیم التابعی الجلیل قال ان للحدیث ضوء کضوء النهار یعرف و ظلمة کظلمة اللیل تنکر[۳].

(ربیع بن خثیم تابعی جلیل فرماتے ہیں کہ صحیح حدیث میں دن کی روشنی کی طرح ایک خاص قسم کی روشنی ہوتی ہے کہ جو ارباب بصیرت کے نزدیک پہچانی جاتی ہے اور موضوع حدیث میں رات کی تاریکی کی طرح ایک خاص قسم کی تاریکی ہوتی ہے جس کو ارباب بصیرت قبول نہیں کرتے)۔

جس طرح اصحاب ذوق کو، غالب اور ذوق کے کلام میں دوسرے کسی کلام کی آمیزش فوراً معلوم ہوجاتی ہے، اسی طرح حدیث نبوی کے ذوق رکھنے والے حدیث نبوی میں غیر نبی کے کلام کی آمیزش فوراً تاڑ لیتے ہیں۔ اور جس طرح حالی اور غالب کے فرق سمجھنے کے لیے سخنداں[۴]

---

(۱) ملا علی القاری، الموضوعات: قواعد التحدیث: ص ۱۴۷

(۲) جس رنگ کا چاہے لباس پہن لے ہم تو تیرے قد سے تجھے پہچان لیتے ہیں۔

(۳) قواعد التحدیث: ص ۱۴۸

(۴) سخنداں: ماہر زبان

ہونا شرط ہے۔ دہقان[1] حالی اور غالب کے فرق کو کیا سمجھے۔ اسی طرح صحیح اور غیر صحیح میں فرق سمجھنے کے لیے حدیث داں اور صاحب ذوق ہونا شرط ہے۔ ع

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست[2]

شیخ ابوالحسن علی بن عروہ بن حنبلی کتاب الکواکب میں فرماتے ہیں جس کی فطرت سلیم ہو، قلب اس کا نور تقویٰ سے منور ہو، صدق اور اخلاق اس کا مزاج ثانی بن چکا ہو، سنتے ہی اس کو جھوٹ اور سچ کا پتہ چل جاتا ہے۔

قال بعض السلف ان العبديهم بالكذب فاعرف مراده قبل ان يتم و قد قال تعالیٰ و لتعرفنهم فی لحن القول.

(بعض بزرگان دین یہ فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص جھوٹ بولنا شروع کرتا ہے تو بات پوری کرنے سے پہلے ہی میں اس کے جھوٹ کو پہچان لیتا ہوں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

کہ اے نبی کریم ہم نے آپ کو ایسا خاص نور فراست عطا کیا ہے کہ اس سے آپ منافقین کو ان کے لب و لہجہ ہی سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ نفاق کی بات ہے یا اخلاص کی)۔

ولهذا كان كعب بن مالكؓ بعد ان عمی اذ تكلم الرجل بين يديه بالكذب يقول له اسكت انی لاجد من فيک رائحه الكذب واذا سمع حديثا مكذوبا عرف كذبه وذلک انه جمع الصدق لرسول الله صلی الله عليه وسلم لما قدم من غزوة تبوک و انزل الله عزوجل يا ايها الذين آمنوا

---

(۱) دہقان: ان پڑھ کسان

(۲) اے دلبر! تو خود تو سخن شناس ہے نہیں، ہماری بات میں تجھے غلطیاں نظر آتی ہیں۔

اتقوالله وكونوا مع الصادقين فان الله سبحانه يلهم الصادق الذكى معرفة الصدق من الكذب كما في الحديث: الصدق طمانينة والكذب ريبة.

(کعب بن مالک صحابیؓ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی ایمانی فراست عطا کی تھی کہ نابینا ہونے کے بعد ان کا یہ حال تھا کہ جب کوئی شخص ان کے سامنے کوئی جھوٹ بات کہتا تو یہ فرماتے خاموش رہو میں تیرے منہ سے جھوٹ کی بدبو محسوس کرتا ہوں۔ کعب بن مالک جب کبھی کوئی جھوٹ بات سنتے فوراً پہچان لیتے اور فوراً اس کی تکذیب کردیتے یہ اس صدق اور اخلاص کی برکت تھی کہ جو ان سے غزوہ تبوک کے واقعہ میں ظاہر ہوا۔ اور اللہ عزوجل نے اس بارہ میں آیت نازل فرمائی اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور صادقین اور سچوں کی صحبت اختیار کرو۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ صادق اور راست باز کو صدق اور کذب کی پہچان عطا فرمادیتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ صدق سے قلب سلیم کو اطمینان ہوتا ہے اور کذب دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے)۔

وقد قال عمربن خطابؓ اقربوا من افواه المطيعين واسمعوا منهم ما يقولون فانهم تتجلى لهم امور صادقة. وقال عمرالحق ابلج لا يخفى على فطن وقال حذيفة ان في القلب سراجايزهر.

(حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ اللہ کے مطیع اور فرماں بردار بندوں کے منہ کے قریب ہو کر ان کی باتیں سنو من جانب اللہ ان پر امور صادقہ واضح اور منکشف ہوتے ہیں۔ اور حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا کہ حق واضح اور روشن ہے۔ عاقل اور سمجھ دار پر مخفی نہیں رہ سکتا۔ حذیفہ ابن الیمان فرماتے ہیں کہ مومن کے قلب میں ایک چراغ روشن ہوتا ہے جس سے وہ حق اور

باطل، صدق اور کذب کے فرق کا آنکھ سے مشاہدہ کرتا ہے) حق جل شانہ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے حضرات محدثین کو خاص نور فہم اور اذر فراست عطا فرمایا تھا۔ جس سے ان کو صحیح اور موضوع کا فرق بدیہی طور پر نظر آتا تھا۔ اتباع سنت اور لیل و نہار کلمات نبویہ کی مذاکرات اور مزاولت سے حضرات محدثین خداوند ذوالجلال کے اس درجہ مقرب اور محبوب ہوگئے تھے کہ اللہ ہی کی سمع سے سنتے تھے اور اللہ ہی کی بصر سے دیکھتے تھے۔

العین تعرف من عینی محدثها　　ان کان من حزبها او من اعادیها

(محب کی آنکھ بات کرنے والے کی آنکھوں ہی سے تاڑ لیتی ہے کہ یہ بات کرنے والا محبوبہ کے محبین میں سے ہے یا مخالفین میں سے)۔

انارة العقل مکسوف بطوع ہوی　　وعقل عاصی الھوی یزداد تنویرا

(ہوائے نفسانی[1] کی اطاعت سے عقل کی روشنی کسوف[2] اور خسوف[3] میں آجاتی ہے اور جو عقل ہوائے نفسانی کی نافرمانی کرے اس کے نور میں زیادتی ہوجاتی ہے)۔

جبکہ حضرات اولیاء اللہ کے لیے الہام اور کشف سے امور تکوینیہ کا انکشاف کتاب اللہ، سنت متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے تو حضرات محدثین کے لیے صدق اور کذب کا انکشاف کیوں محال سمجھتے ہو۔ جس کو خداوند ذوالجلال۔ اکل حلال اور صدق مقال[4] کی بے مثال اور

---

(۱)　ہوائے نفسانی: نفس کی خواہشات

(۲)　کسوف: گرہن (سورج کا)

(۳)　خسوف: گرہن (چاند کا)

(۴)　صدق مقال: قول کی سچائی

لازوال دولت سے مالا مال فرمادیں اس کے لیے صدق و کذب کی پہچان کوئی مشکل نہیں۔ حق تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو وہ نور فراست عطا فرمایا تھا کہ جس سے وہ کھیلتے ہوئے بچوں کے دلوں کا نقش ایمان اور نقش کفر دیکھتے تھے کہ اس کے دل پر ایمان کا نقش ہے اور اس کے دل پر کفر کا نقش ہے۔

یہی وہ علم لدنی ہے جس کو حق تعالیٰ نے وعلمناہ من لدنا علما[۲] میں ذکر فرمایا ہے۔ اور امام غزالیؒ نے اس بارہ میں رسالہ لدنیہ کے نام سے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا جو چھپا ہوا بازاروں میں ملتا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ دجال کی پیشانی پر کافر لکھا ہوا ہوگا جس کو ہر مسلمان پڑھ لے گا خواہ مسلمان پڑھا ہوا ہو یا ان پڑھ ہو یعنی جس کی بصر اور بصیرت نور ایمان سے منور اور سرنگیں ہوگی۔ اس کو کذاب اور دجال کا کذب اور دجل آنکھوں سے نظر آجائے گا جس درجہ کا نور ہوگا اسی درجہ کا انکشاف ہوگا جس درجہ کا چراغ ہوگا اسی درجہ کی روشنی ہوگی۔

یہ تمام تر شیخ ابوالحسن حنبلی دمشقی کے کلام کا خلاصہ ہے[۳]۔

حکایت

اس سلسلہ میں شیخ ابوالحسن نے اپنا ایک واقعہ بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جب کوئی حدیث سنتے تو سنتے ہی بتلادیتے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا موضوع۔ بعد میں تحقیق کرتے تو معلوم ہوتا کہ حضرات محدثین نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ ہم نے ان بزرگ سے دریافت کیا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ حدیث صحیح یا موضوع

---

(۲) ۱۸: الکہف: ۶۵

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے، حماحی قواعد التحدیث، ص ۱۴۸

تو فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں ایک خاص عظمت اور جلال ہوتا ہے جو دوسرے کے کلام میں نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح صحابہ کرامؓ کا کلام دوسروں کے کلام سے ممتاز ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب[1]۔

حق تو یہ ہے

کہ وضع احادیث ہی حجیت احادیث کی دلیل ہے۔ اگر حدیث حجت نہ ہوتی تو وضع حدیث کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔ معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں حدیث کی حجیت مسلم تھی۔ اسی لیے تو وضاعین اور کذابین حدیثیں بناتے تھے تاکہ حدیث کے نام سے قبول کرلی جائے۔

تا نباشد راست کے باشد دروغ　　　آں دروغ از راست می یابد فروغ

(جھوٹ بولنا ہی صدق کی حجت ہونے کی دلیل ہے اگر صدق حجت نہ ہوتا تو کذب کی ضرورت نہ ہوتی)۔

واضعین حدیث کا دنیا میں ہونا تو قابل تعجب نہیں۔ ہر زمانہ میں جھوٹے ہوئے ہیں اور ہیں۔ لیکن عقلاً یہ ناممکن ہے کہ ایک زمانہ اور خصوصاً خیر القرون کا زمانہ پورا کا پورا ایسا گذر جائے کہ جھوٹے سچوں پر غالب آجائیں اور صدق اور کذب کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ اور ایک بھی ایسا عاقل اور سمجھ درار نہ ہو کہ صدق اور کذب کو پرکھ سکے۔ حضور پر نور ﷺ جس وقت دنیا سے اٹھے تو ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ کرام چھوڑے، کیا کسی کی عقل میں آسکتا ہے کہ جس ذات با برکات پر ایک لاکھ سے زیادہ انسان ایمان لائے ہوں۔ اور جان و مال اور خویش و اقارب سب ان پر قربان کرچکے

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے، سماحی قواعد التحدیث، ص ۱۴۸

ہوں اور عشق نبوی ﷺ میں وہ اس درجہ کو پہنچ چکے ہوں کہ لاکھوں مجنوں بھی ان کی گرد کو نہ پہنچتے ہوں۔ ایسے فرزانے اور دیوانے وصال کے بعد یکلخت حضور ﷺ کو بھول جائیں اور کسی سے حضور ﷺ کا نہ کوئی حال بیان کریں اور نہ حضور ﷺ کے کسی قول اور فعل کی کسی سے کوئی حکایت اور روایت کریں۔ لامحالہ ضرور حکایت و روایت کی ہوگی۔ جس طرح مجنوں کا لیلیٰ کو بھول جانا محال ہے اسی طرح صحابہ کرامؓ کا حضور پر نور ﷺ کو بھول جانا اس سے ہزار درجہ بلکہ لاکھ درجہ بڑھ کر محال ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے حضور پر نور ﷺ کے جو حالات تابعین سے بیان کئے آخر وہ کہاں گئے منکرین حدیث کہتے ہیں کہ وہ سب گم ہوگئے۔ حضرات شیعہ کہتے ہیں کہ فقط حدیث کا ذکر مت کرو بلکہ قرآن کریم بھی گم ہوگیا ہے چلو دین کا قصہ ختم ہوا۔ ایک نے حدیث گم کی اور ایک نے قرآن گم کیا۔ اب بتلاؤ کہ باقی کیا رہ گیا۔ اور جب نہ قرآن باقی رہا اور نہ حدیث باقی رہی تو دین اور شریعت سے آزادی ملی۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو جی چاہے کرے۔ اور حلال و حرام اور یجوز لایجوز[1] کی تقسیم یہ سب ملاؤں کی من گھڑت ہے۔ اور دوزخ اور بہشت کا قصہ یہ بھی ملاؤں کا بنایا ہوا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

حدیث اور تاریخ میں فرق

تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جن لوگوں کو حدیث کے حجت اور مستند ہونے میں کلام ہے، وہ لوگ تاریخ کے غایت درجہ معتقد اور دلدادہ

---

(۱) یجوز اور لایجوز: جائز و ناجائز

ہیں اور اس کے مطالعہ کو نہایت ہی ضروری سمجھتے ہیں۔ اور علم تاریخ میں ان کو وہ شبہات پیدا نہیں ہوتے جو حدیث میں پیدا ہوتے ہیں۔ حالانکہ حدیث بھی ایک خاص قسم کی تاریخ ہی ہے۔ اگر اس نام ہی سے ان کو وحشت ہوتی ہے تو اس کو تاریخ اسلامی کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں، لیکن تاریخ کو حدیث سے کوئی نسبت نہیں۔

١۔ اول تو حدیث کا جاننا اور اس کا یاد کرنا اور اس پر عمل کرنا اور لوگوں تک اس کا پہنچانا فرض اور واجب ہے۔ اور تاریخی واقعات کا جاننا اور لکھنا فرض ہے اور نہ واجب نہ مستحب۔

٢۔ حدیث کا تعلق صرف ایک ذات سے ہے اور وہ بھی ایسی کہ جس پر ایمان لانا ضروری ہے بخلاف تاریخ کے کہ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی ذات سے متعلق ہو، تاریخ کبھی کسی ملک کی لکھی جاتی ہے، کبھی کسی خاص شہری کی، کبھی کسی خاندان کی۔ اور اگر ایک شخص کی بھی لکھی تو اس پر ایمان لانا ضروری نہیں۔

٣۔ مؤرخین کی عموماً یہ عادت ہے کہ جب کسی قوم اور ملک کی تاریخ لکھتے ہیں تو اس میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے ضرور کام لیتے ہیں۔ جس سے موافقانہ تعلق ہوتا ہے اس کو برنگ واقعات بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جس سے مخالفانہ تعلق ہوتا ہے اس کو برنگ واقعات گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آنے والوں کو صحیح حقیقت کا پتہ نہیں چلتا۔ بخلاف حدیث کے کہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنا جہنم میں ٹھکانا بنانا ہے۔

٤۔ حدیث کے اصل راوی وہ ہیں جنہوں نے آپ کے کلمات طیبات کو اپنے کانوں سے سنا اور آپ کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بخلاف

مورخین کے کہ جو واقعات وہ لکھتے ہیں وہ ان کے چشم دید نہیں ہوتے۔ سنے سنائے واقعات جو غیر معتبر ذرائع سے ان کو فراہم ہوئے ان کو مرتب کر کے تاریخ تیار کر دی۔

۵۔ تاریخی روایتوں کے لیے کوئی سند ہی نہیں نہ صحیح اور نہ ضعیف، نہ قوی اور نہ مسلسل، نہ مشہور اور نہ متواتر کہ جس پر یقین کیا جا سکے اور اگر سند بھی معلوم ہو تو اس کے راویوں کے حالات نامعلوم غرض یہ کہ مجہول در مجہول قصہ ہے۔ اور ہر حدیث کے لیے سند بھی موجود ہے۔ اور ایک سند نہیں سو سو سندیں موجود ہیں۔ صحاح ستہ میں بکثرت ایسی حدیثیں ہیں کہ جو دس دس اور بیس بیس سندوں سے مروی ہیں۔ غرض یہ کہ ہر حدیث کی سند ہے اور راویوں کا حال معلوم کرنے کے لیے علم اسماء الرجال ہے۔ اور روایت کے قبول اور معتبر ہونے کے لیے کیا کیا شرطیں ہیں، وہ تمام بالتفصیل علم اصولِ حدیث میں مذکور ہیں۔ پھر حدیث کے راویوں کی احتیاط کا یہ حال کہ جہاں ذرا بھی کسی لفظ میں شبہ ہو جائے تو وہاں اپنی طرف سے کوئی مرادف لفظ بھی نہ لکھیں بلکہ او نحوہ[1] کا استعمال کریں۔ بھلا اس احتیاط کی نظیر دنیا کی کسی تاریخ میں بھی مل سکتی ہے۔

استاد کے حافظہ میں ذرا فرق دیکھا، اسی وقت اس کی روایت کر دی، جس کے متعلق ایک مرتبہ بھی روایت میں کذب[2] ثابت ہو گیا تو اس کی تمام روایات غیر معتبر قرار دی گئیں۔ اسی وجہ سے محدثین کے یہاں

---

(۱) حدیث نقل کرنے والے صحابہ و تابعین کا یہ معمول ہے کہ اگر انہیں کسی لفظ میں شبہ ہو تو یہ ضرور کہتے ہیں یوں کہا یا اسی طرح کے الفاظ کہے۔

(۲) کذب: جھوٹ

رافضی[1] کی کوئی روایت معتبر نہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ ہر حدیث کے لیے سند موجود ہے اور تاریخی روایات میں ایک روایت کی بھی سند موجود نہیں۔ پس تعجب اور حیرت ہے کہ علم حدیث جس کی ایک بات بھی بے سند نہیں۔ وہ تو غیر مستند اور غیر معتبر ہوجائے اور علم تاریخ جو از اول تا آخر بے سند ہے، وہ مستند اور معتبر ہوجائے۔ اور خصوصاً اس صدی کی تاریخیں جو تمام تر رسائل اور جرائد سے ماخوذ ہیں[2] جن کی اشاعت کا مقصد ہی اپنی اغراض کا پروپیگنڈا ہوتا ہے ان تاریخوں میں ان حضرات کو کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ اور حدیث نبوی میں ان کو ہر قسم کا شبہ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ دنیا میں حدیث نبوی سے زیادہ کوئی سچی اور معتبر تاریخ نہیں، نہ ہوئی، نہ ہوگی اور نہ ہوسکتی ہے اگر ہے تو دکھلائی جائے۔ پس اگر حدیث نبوی معتبر نہیں تو پھر دنیا کی کوئی تاریخ معتبر نہیں ہوسکتی۔

پانچواں شبہ

بہت سی حدیثیں خلاف عقل ودرایت ہیں۔

جواب

کوئی صحیح اور معتبر حدیث خلاف عقل نہیں۔ خلاف عقل وہ ہے کہ جس سے کوئی محال[3] لازم آئے جیسے اجتماع نقیضین[4] یا ارتفاع

---

(۱) رافضی: شیعہ

(۲) مؤرخین نے جن چیزوں کو ماخذ تاریخ شمار کیا ہے۔

(۳) محال: ناممکن

(۴) اجتماع نقیضین: دو بالکل متضاد چیزوں کا ایک وقت میں ایک جگہ جمع ہونا

نقیضین[1] سو الحمد للہ ذخیرہ حدیث میں کوئی صحیح[2] اور حسن[3] تو کیا۔ بلکہ کوئی ضعیف حدیث[4] بھی ایسی نہیں جس سے کوئی محال لازم آئے، یہ ملاحدہ[5] تو ہر اس چیز کو جو ان کے وہم اور خیال میں نہ آئے۔ محال سمجھتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو محال اور ممکن کے معنیٰ بھی معلوم نہیں۔ شریعت کا کوئی حکم بھی خلاف عقل نہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ عقل سلیم ہو۔ سقیم یعنی مریض اور بیمار نہ ہو۔ عقلِ سلیم وہ ہے کہ جو روحانی بیماریوں سے پاک ہو۔ یعنی ہوائے نفسانی، کبر و نخوت، حرص، طمع اور حب دنیا۔ اس قسم کے تمام امراض سے پاک ہو۔ معیار عقل سلیم ہے۔ ہر شخص کی عقل معیار نہیں بن سکتی۔ قرآن حکیم ایک طرف عقل سلیم کی طرف رجوع کا حکم دیتا ہے اور دوسری طرف اپنے رسول کی بے چون و چرا اطاعت کو فرض، لازم اور جزوایمان قرار دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ رسول کا کوئی قول، کوئی فعل اور کوئی حکم خلاف عقل نہیں۔ ورنہ لازم آئے گا کہ قرآن کریم دو متضاد چیزوں کے قبول کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے کہ جب حدیث خلاف عقل ہوگی تو لامحالہ ایک کے قبول کرنے سے دوسرے سے ضرور سرتابی کرنی پڑے گی۔ جو لوگ کہ حدیث کو

---

(۱) دونوں مقابل چیزوں کا ختم ہونا۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ نہ دن ہے اور نہ رات

(۲) صحیح حدیث: تعریف کے لیے دیکھیے حاشیہ ۴۲

(۳) حسن حدیث: تعریف کے لیے دیکھیے حاشیہ ۴۲

(۴) ضعیف حدیث ایسی روایت جو حسن کی شرائط میں سے کسی شرط کے نہ ہونے کی وجہ سے حسن کے مرتبہ تک نہ پہنچی ہو

(۵) ملاحدہ: ملحد کی جمع ہے، بے دین

خلاف عقل بتلاتے ہیں وہ حدیث عقل سلیم کے خلاف نہیں ہوتی البتہ صرف ایک ان کی عقل سقیم کے خلاف ہوتی ہے جو ہزار ہا نفسانی ظلمتوں اور نجاستوں سے آلودہ ہوتی ہے۔ جس کا حاصل یہ نکلا کہ حدیث کے پرکھنے کا معیار صرف اپنی عقل کو بنانا چاہتے ہیں کہ جو روحانی سل اور تپ دق کی بیماری میں مبتلا ہے۔ اور ہر شخص کی عقل کو معیار بنانا خود خلاف عقل ہے جس کو کوئی عاقل قبول نہیں کرسکتا۔ نیز براہین عقلیہ اور قطعیہ[1] سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عقل مبارک کا سلیم اور کامل الصحت ہونا ثابت ہے۔ لہذا کسی سقیم العقل اور مریض الفہم بلکہ مختل العقل اور بد حواس کی بکواس کی وجہ سے کسی مسلم سلیم العقل کے حدیث اور قول کو رد کرنا خود خلاف عقل ہے۔ احادیث خلاف عقل تو کیا ہوتیں ذخیرہ حدیث تو ایک عجیب و غریب مائدہ علم ہے[2] جس پر عقل سلیم کے تمام مرغوبات لذائذ اور طیبات چنے ہوئے ہیں۔ سلیم الطبع اور صحیح المزاج جب ان کو استعمال کرتا ہے تو ان کی لذت اور منفعت کو محسوس کرتا ہے اور جن کے قلوب میں مرض ہے ان کو یہ پاکیزہ غذا موافق نہیں پڑتی۔ صفراوی بخار والے کو جس قدر لذیذ اور عمدہ غذا دی جائے اسی قدر اس کے بخار اور صفراء میں اضافہ ہوگا۔

ومن یک ذافم مر مریض ۔۔۔ یجد مراً بہ الماء الز لالا

(جس کا منہ بیماری کی وجہ سے کڑوا ہو تو اس کو چشمہ کا شفاف پانی بھی کڑوا

---

(۱) براہین عقلیہ اور قطعیہ: انتہائی یقینی عقلی دلائل

(۲) بقول ابن الملقن صرف اصول حدیث سے متعلق علوم کی انواع ۲۰۰ سے زائد ہیں۔ دیکھیے سیوطی، تدریب، ج ۱: ص ۵

لگے گا)۔

منکرین حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہیں۔ اپنی عقل سقیم کے فیصلہ پر راضی ہیں۔ عملاً اپنی عقل سقیم کو بمنزلہ رسول کے سمجھتے ہیں بلکہ اپنی نفسانی خواہشوں کو اپنا معبود بنارہے ہیں۔ افرأیت من اتخذالهه هواه[1]. اپنی عقل سقیم کو حکم اور فیصل قرار دینا ایسا ہے کہ جیسا کوئی مریض طبیب کی طرف رجوع کرنے کو عبث بتلانے اور یہ دعوے کرے کہ میں خود ہی اپنا علاج کرلوں گا حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ[2] فرمایا کرتے تھے کہ کسی روایت کے خلاف درایت[3] ہونے کا اگر یہ مطلب ہے کہ یہ روایت زید، عمرو، بکر یا چودھویں صدی کے کسی خاص فاضل اور علامہ کی درایت کے خلاف ہے تو اس مدعی درایت کے ذمہ یہ لازم ہے کہ پہلے وہ اپنی عقل اور درایت کی عصمت اور سلامت یا صحت اور محفوظیت کو ثابت کرے ورنہ جمہور سلف اور خلف کے خلاف، خلاف درایت ہونے کا دعویٰ سراسر شوخ چشمی اور خلاف درایت ہے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ تمام اہل اسلام اور تمام علماء اور حکماء کی درایت کے خلاف ہے تب بھی یہ دعویٰ محتاج دلیل ہے، حضرات صحابہ و تابعین، ائمہ دین اور علماء ربانیین کی عقول سلیمہ نے جب کسی روایت کو قبول کرلیا تو آج کسی فاضل اور علامہ کی مجال نہیں کہ وہ اس روایت کو خلاف درایت بتائے۔ وہ مدعی عقل ودرایت درحقیقت اس شعر کا مصداق ہے۔

---

(۱) ۲۵: الفرقان: ۴۳

(۲) مولانا شبیر احمد عثمانی: م ۱۹۴۹ء

(۳) درایت: تعریف کے لیے دیکھیے صفحہ ۱۰۹ حاشیہ ۲

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے   حاصل خواجہ بجز پندار نیست[1]

جواب دیگر

اگر احادیث کا انکار اس لیے کیا جارہا ہے کہ بہت سی حدیثیں آپ کے نزدیک خلاف عقل ہیں تو بہت سے لوگ کچھ ایسے مزاج کے بھی ہیں کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات کو خلاف عقل بتلاتے ہیں۔

چھٹا شبہ

قرآن کریم ایک جامع، کامل اور مکمل کتاب ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی کتاب کی ضرورت نہیں۔

جواب

جامع ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ لفظ تو تھوڑے ہیں۔ مگر بہت سے معانی اور علوم و معارف کو جامع اور حاوی ہیں۔ گویا کہ دریا کو کوزہ میں بھرا ہوا ہے۔ جامع کے یہ معنیٰ نہیں کہ اس کلام کے لیے کسی شرح اور حاشیہ کی بھی ضرورت نہیں۔ قال اللہ تعالیٰ انزلہ بعلمہ[2].

اس آیت شریفہ کے بھی یہی معنیٰ ہیں کہ حق تعالیٰ نے غیر محدود علوم و معارف کو قرآن کے محدود الفاظ میں بھر دیا۔ اسی وجہ سے حدیث میں آیا ہے کہ لا تنقضی عجائبہ[3] قرآن کریم کے لطائف و معارف کبھی

---

(۱) خواجہ یہ سمجھتا ہے کہ اسے سب کچھ حاصل ہوگیا حالانکہ خواجہ کا حاصل اس کی اس خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں

(۲) ۴: النساء: ۱۶۶

(۳) دارمی، ابو محمد عبداللہ، سنن الدارمی (۳۳۳۵) ج ۲: ص ۳۱۳۔ فضائل قرآن

ختم نہ ہوں گے اور علیٰ ہذا قرآن کریم کے کامل کتاب ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ایسے محکم اصول اور کلیات پر مشتمل ہے کہ قیامت تک آنے والی جزئیات کے احکام اس سے مستنبط ہو سکیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی کتاب غایت درجہ موجز[۱] اور مختصر ہوگی اور پھر غایت ایجاز[۲] کی وجہ سے حد اعجاز[۳] کو پہنچی ہوئی ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی معجز کتاب کے مخدرات[۴] کے چہرہ سے سوائے خدا کے برگزیدہ بندہ کے کوئی نقاب نہیں اٹھا سکتا۔ اللہ کے نبی اور رسول نے سب سے پہلے ان مخدرات کا نقاب اٹھا کر اپنے صحابہ کرام کو ان کا حسن و جمال دکھلایا اور پھر صحابہ نے اپنے شاگردوں کو۔ ثم و ثم انشاء اللہ تعالیٰ اسی طرح قیامت تک سلسلہ جاری رہے گا۔

منکرین حدیث یہ کہتے ہیں کہ بے شک ہمیں ضرورت نہیں کہ پیغمبر علیہ السلام ان مخدرات کا نقاب اٹھا کر ان کا حسن و جمال ہم کو دکھلائیں ہمیں اللہ نے خود آنکھ دی ہے۔ ہم خود ہی اس کا حسن و جمال دیکھ لیں گے۔ ہمیں کسی کے دکھلانے کی ضرورت نہیں۔

اللہ اکبر۔ آپ کو اپنی آنکھ کے متعلق اس قدر حسن ظن ہے کہ

---

(۱) موجز: صفت ایجاز کا حامل

(۲) غایت ایجاز: علامہ قزوینی کے نزدیک ایجاز کے معنیٰ یہ ہیں کہ ادائے مقصود کے لیے تعبیر مقصود و مراد کی نسبت کم ہو لیکن وہ تعبیر اپنے اختصار کے باوجود مراد بخوبی ادا کر رہی ہو۔ دیکھیے مولانا محمد مالک کاندھلوی منازل العرفان ص ۳۵۳۔

(۳) حد اعجاز: اس عبارت میں ایسا حسن اور ایسی خوبی ہوگی کہ مخلوق اس کا مثل پیش کرنے سے قاصر ہوگی۔

(۴) مخدرات: پوشیدہ علوم و معارف

اللہ کے نبی ورسول کی آنکھ سے مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی شان تو بہت بلند ہے۔ صحابہ اور تابعین سے آنکھ لڑانا بھی شوخ چشمی اور بے حیائی کی دلیل ہے۔ قرآن کریم بلاشبہ جامع اور کامل کتاب ہے۔ مگر جامع اور کامل کتاب کے سمجھنے کے لیے عقل بھی تو جامع اور کامل چاہیئے۔ ناقص اور بیمار عقل تو اس کے لیے کافی نہیں۔ اور ناقص کا اپنے کو کامل سمجھ بیٹھنا بھی اس کے ناقص ہونے کی دلیل ہے۔ کتاب جس درجہ کامل ہوگی اسی درجہ محتاج شرح ہوگی تاکہ شرح سے اس کے مخفی حقائق اور رموز ظاہر ہوں اور اس طرح سے اس کتاب کا کمال نمایاں ہو۔ جب تک کسی کتاب کے حقائق اور معارف کی تفصیل نہ کی جائے۔ اس وقت تک اس کتاب کا کمال نمایاں نہیں ہوتا۔ منکرین حدیث نے جامع اور کامل کے یہ معنی سمجھے کہ قرآن کے سمجھنے کے لیے حدیث نبوی اور اقوال صحابہ کی ضرورت نہیں۔ سبحان اللہ کیسی جامع اور کامل عقل ہے کہ جو جامع اور کامل کے معنیٰ بھی نہیں سمجھتی۔

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے   حاصل خواجہ بجز پندار نیست [1]

ساتواں شبہ

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضور نے صحابہ سے فرمایا کہ لا تکتبوا عنی غیر القرآن [2] سوائے قرآن کے مجھ سے کوئی بات نہ لکھو۔ پس اگر حدیث حجت ہوتی تو حضور اس کی کتابت سے منع نہ

---

(۱) خواجہ یہ سمجھتا ہے کہ اسے سب کچھ حاصل ہو گیا، حالانکہ خواجہ کا حاصل اس کی اس خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) مسلم، الجامع الصحیح، ج ۲: ص ۴۱۴، باب التثبت فی الحدیث و حکم کتابة العلم.

فرماتے۔

جواب

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت صرف قرآن کریم کے لکھنے کا اہتمام کرو۔ ایک ایک لفظ کی حفاظت ضروری ہے نماز بغیر اس کی قراءت کے درست نہیں۔ نیز قرآن کریم میں معانی کی طرح الفاظ بھی مقصود بالذات کے درجہ میں ہیں اور احادیث میں مقصود بالذات معانی ہیں۔ الفاظ حدیث کی حفاظت معانی کی حفاظت کے لیے ہے۔ اس لیے حدیث کی کتابت میں چنداں اہتمام کی ضرورت نہیں۔ اس وقت فقط قرآن کریم کی کتابت کا اہتمام ضروری ہے۔ اس لیے حضور نے خاص اہتمام تو کتابت قرآن کا فرمایا۔ کاتبین وحی مقرر فرمائے۔ البتہ جن لوگوں نے از خود حدیث نبوی کی کتابت کی اجازت چاہی ان کو اجازت دی[1] اور وقت ضرورت خود بھی خاص خاص احکام[2] اور خاص خاص خطبوں[3] کے لکھنے کا حکم دیا، تاکہ معلوم ہوجانے کا کتابت حدیث میں

---

(۱) عبداللہ بن عمرو بن العاص کو آپ ﷺ نے لکھنے کی اجازت دی تھی، انہوں نے دریافت کیا کہ ہر چیز لکھ لیا کروں یا صرف وہ الفاظ لکھا کروں جو آپ فرحت وانبساط کی حالت میں فرمائیں آپ ﷺ نے اپنے ہونٹوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، اس منہ سے کوئی بات غیر حق نہیں نکل سکتی، تم ہر چیز لکھ لیا کرو۔ دیکھیے، المستدرک، ج ۱: ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

(۲) کتاب الصدقہ کے نام سے آپ ﷺ نے کچھ حدیثیں اہتمام سے لکھوائی تھیں جن میں جانوروں کی زکوٰۃ سے متعلق احکام تھے۔ سنہ ۱۰ھ میں آپ ﷺ نے عمرو بن حزم کو نجران کا گورنر متعین کیا تو ایک صحیفہ املاء کرایا، عہد رسالت کی یہ دو اولین سرکاری دستاویز تھیں۔ دیکھیے دار قطنی، سنن، ج ۳: ص ۲۰۹۔

(۳) خطبہ حجۃ الوداع کو لکھنے کا حکم دیا

ذرہ برابر کوئی حرج نہیں بلکہ مستحسن ہے[۱] اس لیے کہ جو لوگ حضور کے کلمات طیبات کو قلم بند کرتے تھے۔ حضور ان کو بنظر استحسان ہی دیکھتے تھے۔ اور عقلا کتابت حدیث کے قبیح ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ سرور عالم ﷺ کو کوئی نبی اور رسول مانے یا نہ مانے لیکن حضور ﷺ کے راس الحکماء اور تاج العقلاء ہونے میں آج تک کسی کافر نے بھی کلام نہیں کیا۔ لہذا ظاہر ہے کہ حضور پر نور کی زبان فیض ترجمان سے جو کلمہ نکلتا تھا، وہ حکمت اور موعظت کے یواقیت و مرجان ہی ہوتے تھے۔ اور کلمات حکمت و موعظت کی کتابت عقلاً و شرعاً فقط مستحسن ہی نہیں بلکہ اگر ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو واجب اور لازم ہے۔ قال تعالیٰ:

وکتبنا له فی الالواح من کل شئی موعظة و تفصیلا لکل شئی[۲].

(اور ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ کر دی)۔

سب سے پہلی سورت جو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی وہ اقراء ہے جس کے شروع میں علم بالقلم آیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ قلم اور علم۔ اور قلم سے علم کی کتابت حق تعالیٰ کی منن کبریٰ[۳] میں سے ہیں۔ ن والقلم و مایسطرون. اس آیت میں حق تعالیٰ نے دوات، قلم اور کتابت کی قسم کھائی ہے تاکہ قلم اور کتابت کی عظمت اور جلالت ظاہر ہو۔

---

(۲) آپ کے املاءت کی تعداد ۱۰۰ سے زائد ہے۔

(۳) ۷: الاعراف: ۱۴۵

(۴) منن کبریٰ: عظیم احسانات

علم و حکمت کی کتابت

غرض یہ کہ علم و حکمت کی کتابت کا مستحسن ہونا ایسا بدیہی ہے[1] کہ جس میں کسی عاقل کو کلام نہیں بلکہ اگر خرافات اور مہملات کی بھی کسی ضرورت یا مصلحت سے کتابت کی جائے تو وہ بھی عقلاً و شرعاً درست ہے کراماً کاتبین کا کام ہی خیر و شر کو لکھنا ہے اور انہی کراماً کاتبین کے لکھے ہوئے صحائف اعمال قیامت کے دن حساب و کتاب کے وقت پیش ہوں گے جس سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ بلا تشبیہ اور مثال کے خفیہ پولیس کی رپورٹ کو اس اس کا نمونہ سمجھو۔

ما یلفظ من قول الالدیه رقیب عتید[2].

وان علیکم لحافظین کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون[3].

پس جب خرافات اور مہملات کی کتابت کسی ضرورت یا مصلحت سے قبیح نہیں تو احادیث نبویہ اور کلمات قدسیہ جن کے جواہر اور یواقیت موعظت ہونے میں ذرہ برابر شبہ نہیں، ان کی کتابت قطعاً کسی طرح قبیح ہو ہی نہیں سکتی۔ جب کہ امر قبیح کی کتابت حسن ہو سکتی ہے تو امر حسن کی کتابت بدرجۂ اولیٰ حسن بلکہ احسن ہو سکتی ہے۔ قرآن کریم نے جا بجا کتابت کی اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی ہے۔ کتب اللہ[4]. و کتب

---

(۱) بدیہی: بالکل ظاہر

(۲) ۵۰:ق:۱۸

(۳) ۸۲: الانفطار: ۱۱

(۴) کتب اللہ: یہ لفظ قرآن کریم میں ۸ مرتبہ آیا ہے۔

ربکم[1]. و کتبنا[2]. بار بار قرآن عزیز میں آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ کتابت نہایت ہی مستحسن فعل ہے۔ پس جب فعل کتابت کا مفعول بہ یعنی شئی مکتوب بھی امر حسن ہو تو پھر مل کر نورٌ علیٰ نور کا مصداق ہوگا۔ حق تعالیٰ کی ابتداء آفرینش عالم سے یہ سنت رہی کہ حضرات انبیاء پر لکھے ہوئے صحیفے نازل ہوتے۔ صرف خاتم الانبیاء نبی امی فداہ نفسی و ابی و امی پر لکھی ہوئی کتاب نازل نہیں فرمائی۔ حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے اس کی کتابت کرائی[3]۔ اور جب آپ نے دیکھا کہ اسلام کے قدم جم گئے اور عوام میں اسلام پھیل گیا۔ تو سلاطین اور امراء کے نام صحابہؓ سے لکھوا کر دعوت اسلام کی خطوط روانہ فرمائے[4]۔ جس کا کچھ اشارہ قرآن کریم میں بھی موجود ہے قل یااھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا[5] جس کا حاصل یہ ہے کہ اہل کتاب کو اسلام اور توحید کی دعوت دیجئیے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اسی آیت کے مطابق اہل کتاب کے نام تبلیغی خطوط روانہ فرمائے اور ان خطوط

---

(١) کتب ربکم: یہ لفظ قرآن کریم میں ایک مرتبہ آیا ہے۔

(٢) وکتبنا: یہ لفظ قرآن کریم میں ۵ مرتبہ آیا ہے۔

علاوہ ازیں کتاب کا لفظ کل ۲۳۰ مرتبہ آیا ہے جن میں ۱۹۴ مقامات پر اللہ نے کتاب کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

(٣) قرآن کریم کی کتابت کرنے والے صحابہ کرام کاتبین وحی کہلاتے ہیں سیرت نگار مؤرخین کے مطابق کاتبین وحی کی تعداد ۴۰ سے زائد ہے۔ دیکھیئے، سیوطی، الاتقان ج ١: ص

(٤) ابن قیم، زادالمعاد، ج ١: ص ١١٩

(٥) سنہ ٦ھ میں مدینہ منورہ کے مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان ایک معاہدہ جنگ بندی ہوا جسے صلح حدیبیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس صلح کے بعد سنہ ۷ھ میں آپ ﷺ نے مختلف بادشاہوں کے نام خطوط لکھوائے جن کی تعداد ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق (۹) ہے۔ دیکھیے، مجموعة الوثائق السیاسیة: ص ۱۰۴

میں اس آیت شریفہ کا اقتباس بھی فرمایا۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہد ہد کے ہاتھ ملکۂ سبا کے نام دعوت اسلام کا خط روانہ فرمایا۔ اذہب بکتابی ہذا فالقہ الیہم[1]۔ آخر یہ والا نامہ جس کو ہد ہد لے کر گیا۔ سلیمان علیہ السلام کی حدیث ہی تو تھی۔ اور اسی طرح حضور نے اپنے عمال کے نام بہت سے احکام لکھوا کر روانہ کرائے۔ وہ احادیث ہی تو تھیں۔ یہ احادیث کا پہلا مجموعہ تھا جو حضور کے حکم سے مرتب ہوا جس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔

صحابہ کی کتابت حدیث

صحابۂ کرامؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت سے احادیث کو لکھنا بدرجۂ تواتر ثابت ہے۔ اور فقط اجازت ہی نہیں بلکہ کتابت کا حکم بھی ثابت ہے حکیم ترمذی انس بن مالکؓ سے، طبرانی اور حاکم۔ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے راوی ہیں۔ کہ نبی کریم علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا۔ قیدوا العلم بالکتابۃ[2] علم کو کتابت کے ساتھ مقید کرو۔ یعنی علم ایک صید یعنی شکار ہے اور کتابت اس کے لیے قید ہے علم کے صید کو کتابت کی قید میں لاؤ مبادا کہیں حافظہ سے نکل کر اڑ جائے۔ علامہ عزیزی فرماتے ہیں کہ ایک اسناد اس کی صحیح ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرض الوفات کا مشہور واقعہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب صحاح میں موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ دوات، قلم، کاغذ لاؤ کہ تمہارے لئے

---

(۱) ۲۷: النمل: ۲۸

(۲) ابن عبدالبر، جامع بیان العلم، ج ۱: ص ۳۷

ایک تحریر لکھوادوں تاکہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو[1] ظاہر ہے کہ آپ ﷺ جو لکھواتے وہ حدیث ہی تو ہوتی اور حضور ﷺ ہی کا تو ارشاد ہوتا۔ قرآن تو نہ ہوتا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ حضور ﷺ کی زندگی کا آخری فعل ہے۔ اس میں نسخ اور تغیر و تبدل کا کوئی احتمال نہیں۔ ممانعت کتابت کا حکم بلاشبہ مرض الوفات کے واقعہ سے پہلے کا ہے۔ جو اس آخری حکم سے منسوخ سمجھا جائے گا۔ کتابت حدیث کی ممانعت کا حکم کسی وقتی مصلحت پر محمول ہوگا۔ جب تک وہ مصلحت رہی، حکم باقی رہا اور جب وہ مصلحت ختم ہوگئی، تو ممانعت کا حکم بھی ختم ہوگیا۔

اور اگر بالفرض والتقدیر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حضور ﷺ نے صحابہ کو بالکلیہ کتابت حدیث سے منع فرمادیا تھا۔ تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ حدیث کی روایت اور اس پر عمل کرنا بھی جائز نہیں۔ کتابت کی ممانعت سے یہ لازم نہیں آتا کہ روایت بھی ممنوع ہوجائے۔ حاکم بسا اوقات کوئی حکم دیتا ہے مگر کسی مصلحت سے اس کے لکھنے کی ممانعت کردیتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حکم واجب العمل بھی نہ رہے۔ خصوصاً جب کہ اسی حدیث میں لا تکتبوا عنی غیر القرآن کے بعد وحدثوا عنی ولا حرج کا لفظ بھی موجود ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ کسی مصلحت سے کتابت کی ممانعت ہے روایت کی ممانعت نہیں۔ صحیح مسلم میں پوری حدیث اس طرح سے ہے۔

عن ابی سعید الخدری ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لا تکتبوا عنی غیر القرآن و من کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا عنی

---

(۱) حاکم نیشاپوری، المستدرک، حیدر آباد، دائرہ معارف، ۱۳۴۱ھ، ج ۱: ص ۱۰۵، ۱۰۶

ولا حرج و من كذب علی متعمدا فليتبوا مقعده من النار [1].

(ابو سعید خذری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور اگر لکھا ہو تو مٹادو۔ البتہ میری حدیث کو زبانی روایت کرو۔ اس میں کوئی حرج نہیں)۔

منکرین حدیث جب اس حدیث کو نقل کرتے ہیں تو حدیث کا اول جملہ لاتکتبوا عنی تو نقل کردیتے ہیں۔ اور آخری جملہ یعنی وحدثوا عنی۔ میری حدیث کو روایت کرو۔ کو ذکر نہیں کرتے تو کیا یہ تلبیس اور کتمان حق نہیں۔ امام نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں۔

قال القاضی كان بين السلف من الصحابة و التابعين اختلاف كثير فی كتابة العلم فكرهها كثيرون منهم ثم اجمع المسلمون علی جوازها وزال الخلاف [2].

(قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ اور تابعین میں کتابت علم کے بارہ میں اختلاف تھا بہت سے علم کی کتابت کو ناپسند کرتے تھے۔ مگر بعد میں تمام مسلمانوں کا جواز کتابت پر اجماع ہوگیا اور وہ اختلاف بالکل ختم ہوگیا)۔

---

(۱) مسلم، الجامع الصحیح (۳۰۰۴) ج۲: ص۲۲۹۸ - کتاب الزہد (۵۳) باب التثبت فی الحدیث وحکم کتابة العلم (۱۶) مطبوعہ بیروت، داراحیاء تحقیق، فواد عبدالباقی۔

(۲) نووی، محی الدین ابوزکریا یحیٰ بن شرف، شرح صحیح مسلم، بیروت، مناھل العرآن، ج۱۸: ص۲۲۹، ۳۰۔ علامہ سیوطی کے مطابق صحابہ کرام میں سے عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری، ابوسعید خدریؓ، ابوہریرہ اور عبداللہ بن عباس ابتداء میں کتابت حدیث کو پسند نہیں کرتے تھے جبکہ حضرت علی، حسن بن علی، عبداللہ بن عمرو، انس بن مالک اور جابر بن عبداللہ شروع ہی سے کتابت حدیث کے قائل تھے اور لکھتے تھے۔ بعد ازاں عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر بھی جواز کے قائل ہوگئے۔ سیوطی تدریب، ج۲: ص۶۵

فاروق اعظمؓ کا مشورہ

(کتابت حدیث کے بارہ میں فاروق اعظمؓ کا صحابہ کرامؓ سے مشورہ)

قد روی البیھقی فی المدخل عن عروۃ بن الزبیر ان عمربن الخطاب اراد ان یکتب السنن فاستشار فی ذلک اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاشاروا علیھا ان یکتبھا فطفق عمر یستخیر اللہ فیھا شھرا ثم اصبح یوما و قدعزم اللہ لہ فقال انی کنت اردت ان اکتب السنن و انی ذکرت قوما کانوا قبلکم کتبوا کتبا فاکبوا علیھا وترکوا کتاب اللہ وانی واللہ لا البس کتاب اللہ بشئی ابدا[۱].

(عروہ بن زبیر راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے احادیث نبویہ کی کتابت کا ارادہ فرمایا کہ اگر احادیث و سنن۔ کتابت میں آجائیں تو نہایت عمدہ ہو، مشورہ کے لیے حضرات صحابہ کو بلایا سب نے بالاتفاق یہی مشورہ دیا کہ سنن نبویہ کی کتابت کرانی چاہیئےاس کے بعد حضرت عمرؓ ایک ماہ تک اللہ تعالیٰ سے اس بارہ میں استخارہ کرتے رہے ایک دن صبح کو اٹھے اور یہ فرمایا کہ میں نے سنن نبویہ کی کتابت کا ارادہ کرلیا تھا لیکن مجھ کو گذشتہ قوموں کا خیال آیا کہ انہوں نے اپنی ایک مذہبی کتاب لکھی اور پھر اس پر اس درجہ جھکے کہ اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھے (مجھ کو بھی یہی اندیشہ ہے) خدا کی قسم میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کسی اور چیز کا ملانا پسند نہیں کرتا)۔

اور ایک اور روایت میں یہ لفظ ہیں واللہ لا اشوب کتاب اللہ بشئی ابداً۔ خدا کی قسم اللہ کی کتاب کے ساتھ آمیزش نہ ہونے دوں گا۔ اور

---

(۱) سیوطی، جلال الدین، تدریب الراوی، بیروت دارالکتب العلمیۃ، ج ۲: ص ۶۷، ۶۸

روایت میں یہ لفظ ہیں۔ لا کتاب مع کتاب اللہ۔ اللہ کی کتاب کے ساتھ کوئی اور کتاب نہیں[1]۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ فاروق اعظمؓ اور حضرات صحابہ حدیث نبوی کو بلاشبہ و تردد۔ حجت اور اس کی کتابت کو موجب سعادت سمجھتے تھے سب سے پہلے خود حضرت عمر کے دل میں کتابت حدیث کا داعیہ پیدا ہوا۔ اور مشورہ کے لیے صحابہ کرامؓ کو بلایا۔ سب نے بالاتفاق یہی مشورہ دیا کہ احادیث اور سنن کی کتابت کرائی جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ دیکھا کہ اس میں شک نہیں کہ حدیث کی کتابت عظیم مصلحت ہے لیکن اس کے ساتھ ایک مفسدہ کا بھی خطرہ ہے خطرہ کو ترجیح دی اور کتابت حدیث کا ارادہ ترک فرمادیا وہ یہ کہ مبادا مصحف خداوندی کے ساتھ کسی دوسرے صحیفہ کی تدوین کا اہتمام خلاف ادب نہ ہو۔ صحابہ کرام بھی ابھی جمع قرآن سے فارغ ہوئے ہیں۔ ابھی اگر جمع حدیث اور تدوین سنت کی طرف متوجہ ہوئے تو مبادا کسی وقت قاصر الفہم[2] صحیفۂ سنت کو مصحف خداوندی کے مماثل نہ سمجھ بیٹھیں۔ لا کتاب مع کتاب اللہ کا لفظ اسی طرف مشیر معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ کسی اور کتاب کی کتابت۔ موہم مماثلت نہ ہو۔ اور پھر رفتہ رفتہ کہیں کتاب اللہ کے چھوڑ بیٹھنے کا سبب نہ بن جائے۔ اور عجیب نہیں کہ بعض لوگوں کا خیال یہ ہوا کہ حدیث نبوی کو قرآن کے ساتھ ملا کر لکھا جائے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا لا اشوب کتاب اللہ بشئی ابدا کتاب اللہ کے ساتھ کسی شئے کی

---

(۱) ابن سعد: الطبقات، ج ۳: ص ۲۰۶۔ ابن عبد البر، جامع بیان العلم وفضلہ، ج ۱: ص ۶۴

(۲) قاصر الفہم: کوتاہ اندیش

آمیزش میں ہر گز پسند نہیں کرتا۔ غرض یہ کہ اس خطرہ کی بنا پر حضرت عمرؓ نے کتابت حدیث کا ارادہ فسخ فرمایا[1]۔ معاذاللہ اگر حضرت عمر فاروقؓ حدیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے تو پہلے ہی سے لکھنے کا کیوں ارادہ فرمایا اور صحابہ کرام سے کیوں مشورہ کیا اور سب نے بالاتفاق کیوں کتابت کا مشورہ دیا۔

صحابہ کے کتابت نہ کرنے کی وجہ

ابن بشکوال فرماتے ہیں۔ کہ "صحابہ کرام اور خلفائے راشدین نے قرآن کریم کی طرح احادیث نبویہ کو ایک صحیفہ میں اس لیے جمع اور مدون نہیں کیا کہ صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں اطراف و اکناف سے آتے تھے اور چلے جاتے تھے اور ان آنے والے حضرات نے جو خصوصاً ارشادات اور کلمات طیبات حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سنے تھے اور اتفاق سے ارشاد کے وقت مجلس نبوی میں ان کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ وہ ارشادات فقط انہی حضرات کے سینوں میں محفوظ تھے اور یہ سب حضرات ایسے مختلف مواضع میں منتشر تھے کہ بہت سوں کو ان کا علم بھی نہ تھا۔ اس لیے ان منتشر اور متفرق حضرات کے پاس سے احادیث نبویہ کا جمع کرنا بہت دشوار تھا۔

نیز قرآن کی طرح احادیث نبویہ کے الفاظ متعین نہ تھے بلکہ مختلف تھے دس آدمی اگر مجلس نبوی میں حاضر ہوئے اور وہاں کوئی واقعہ پیش آیا تو اس واقعہ کی حکایت میں ہر ایک کی تعبیر لامحالہ مختلف ہو گی۔ ارشاد نبوی کے نقل میں بھی ممکن ہے کہ کچھ الفاظ میں تبدیلی ہو جائے اس لیے

---

(۱) فسخ فرمایا: ختم فرمایا۔ ملتوی کردیا

کہ مقصود معنیٰ تھے بعینہ الفاظ کی روایت واجب نہ تھی (اگرچہ وہ تبدیلی صحت روایت میں کوئی قادح[1] نہیں اس لیے کہ وہ حضرات اہل زبان تھے اور اہل فہم تھے مزاج شناس تھے۔ صدق مجسم تھے۔ کذب اور شوائب کذب[2] سے ان کے دل اور زبان پاک تھے) اور اگر بالفرض والتقدیر یہ بھی نہ ہو تو مترجم اور ترجمان سے تو کم نہ تھے۔ نیز حضور ﷺ بھی بسااوقات ایک بات کو مختلف الفاظ سے بیان فرماتے تھے۔ اس لیے قرآن کی طرح احادیث اور سنن کی جمع اور تدوین مشکل تھی۔

اگر بایں ہمہ حضرات صحابہ منتخب احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب فرماتے اور خلافت راشدہ کے زیر اہتمام مرتب ہو کر وہ شائع ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ مجموعہ تمام احادیث اور سنن کو حاوی نہ ہوتا بلکہ ان میں سے ایک منتخب اور قلیل حصہ کا حامل ہوتا اور خلافت راشدہ کی طرف سے شائع ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ لوگ فقط اسی صحیفہ کی احادیث کو حجت سمجھتے کہ جو خلافت راشدہ کی طرف سے شائع ہوا اور وہ احادیث اور سنن جو اس صحیفہ میں نہ ہوتیں ان کو حجت نہ سمجھتے۔ اس طرح امت۔ نبی اکرم ﷺ کے اکثر ارشادات اور کلمات طیبات سے محروم ہوجاتی۔ اس لیے حضرات صحابہ نے حدیث نبوی کی جمع اور تدوین کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور امت کے لیے طلب حدیث کا میدان وسیع کردیا کہ جس جگہ سے چاہیں حدیث نبوی کو تلاش کریں اور جہاں سے ملے وہاں سے لے لیں کسی خاص کتاب اور خاص صحیفہ کی قید نہیں۔ خلافت راشدہ نے تو صرف جمع قرآن پر اکتفا

---

(۱) قادح: مانع، رکاوٹ

(۲) شوائب کذب: جھوٹ کے شبہات

کیا۔ اور احادیث نبویہ کی حفاظت اور اس کی تدوین لوگوں پر چھوڑ دی کسی نے زبانی روایت سے احادیث نبویہ کی حفاظت کی اور کسی نے کتابت کے ذریعہ احادیث کو محفوظ کیا۔ اس طرح احادیث محفوظ ہو گئیں [۱]۔ حضور پر نور کے وصال کے بعد دنیا آپ کے جمال نبوت کے مشاہدہ سے محروم ہو گئی۔ لوگ بے تابی کے عالم میں حضور ﷺ کے دیکھنے والوں پر پروانوں کی طرح گرے۔ صحابہ نے حضور ﷺ کو جو کچھ کرتے دیکھا، وہ تابعین کو کر کے دکھلا دیا۔ اور جو آپ سے سنا تھا، وہ سب ان کو سنا دیا۔ غرض یہ کہ حضور ﷺ کا کوئی قول اور فعل، کوئی حرکت اور سکون ایسا نہ رہا کہ جس کی صحابہ نے تابعین سے حکایت اور روایت نہ کی ہو۔ اس طرح احادیث نبویہ اور سنن مصطفویہ کے تمام تر یواقیت اور جواہر صحابہ کرام کے مبارک سینوں سے تابعین کے مبارک سینوں میں پہنچ گئے۔ صحابہ کرام استاذ ہیں اور تابعین شاگرد ہیں۔ افادہ اور استفادہ کا سلسلہ جاری ہے۔

عہد نبوت ہی سے کچھ صحابہ حضور ﷺ کے ارشاد قلمبند کیا کرتے تھے۔ وصال کے بعد اس میں اور زیادتی ہو گئی لیکن اکثر صحابہ زبانی ہی روایت فرماتے۔ اور اگر کوئی شاگرد ان کی حدیثوں کو لکھنا چاہتا تو اس کو منع فرماتے۔

وعن ابی نضرة قال قلت لابی سعید الخدری الا نکتب ما نسمع منک قال تریدون ان تجعلوها مصاحف ان نبیکم صلی الله علیه وسلم کان یحدثنا فنحفظ فاحفظو کما کنا نحفظ [۲]۔

---

(۱) ابن بشکوال: خلف بن عبدالملک، (۵۷۸ھ)۔ کتاب الصلۃ

(۲) ابن عبدالبر اندلسی، جامع بیان العلم وفضلہ ص ۳۲

(ابو نضرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید خدریؓ سے عرض کیا کہ کیا جو حدیثیں ہم آپ سے سنتے ہیں ان کو قلم بند نہ کرلیا کریں تو فرمایا کہ نبی کریم ﷺ ہم سے زبانی ارشاد فرماتے تھے اور ہم اس کو سن کر یاد کرلیتے پس جس طرح ہم نے رسول اللہ ﷺ سے زبانی سن کر یاد رکھا ہے تم بھی اسی طرح یاد رکھو)۔

یعنی حضور ﷺ نے جس شان سے ہم تک اللہ کا دین اور علم پہنچایا، ہم بھی اس علم کو تم تک اسی طرح پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس طریق اداء میں ہم کو تغیر اور تبدل پسند نہیں۔

ابو موسیٰ اشعریؓ کا عمل

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ایک دن لوگوں کو اپنی روایت فرمودہ حدیثوں کو لکھتے ہوئے دیکھ لیا۔ فرمایا مجھ کو دکھلاؤ کیا لکھا ہے اور پانی منگا کر سب کو دھو ڈالا اور یہ فرمایا کہ جس طرح ہم نے حضور ﷺ سے زبانی سن کر یاد کیا ہے تم بھی اسی طرح سن کر یاد کرو۔ یہ عشق نبوی ﷺ کی انتہا ہے کہ جس طریق سے سنا ہے اسی طریق سے تم کو سنائیں گے اور تم کو اسی طرح سننا اور یاد کرنا ہوگا۔ یہ عشق ادا تھا خوب سمجھ لو چنانچہ حافظ عسقلانیؒ شرح بخاری میں لکھتے ہیں۔

قال العلماء کرہ جماعة من الصحابة والتابعین واستحبوا ان یؤخذ عنھم حفظا کما اخذوا حفظا لکن لما قصرت الھمم وخشی الایمه ضیاع العلم دونوہ وکثرالله دین ثم التصنیف وحصل بذلک خیر کثیر فللہ الحمد

---

(۱) ابن حجر، فتح الباری۔ کتاب العلم، باب کتابة العلم ج۱: ص ۱۸۵

(صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کو حدیث کی کتابت پسند نہ تھی۔ ان کو یہ پسند تھا کہ جس طرح ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بطور حفظ لیا ہے اسی طرح لوگ ہم سے بطور حفظ لیں لیکن جب ہمتیں قاصر ہو گئیں اور علم کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوا تو علماء نے علم حدیث کو مدون کیا اور کثرت سے کتابیں لکھیں جس کی وجہ سے خیر کثیر حاصل ہوئی۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ)۔

منکرین حدیث احادیث کے مٹانے کے واقعات کتب حدیث سے نقل کر کے لوگوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ صحابہ کرام اس لیے احادیث کو جلاتے یا مٹاتے تھے کہ معاذاللہ صحابہ کرام حدیث نبوی کو حجت اور واجب العمل نہیں سمجھتے تھے اور ان کا مقصود ہی مٹانے سے یہ تھا کہ جب حدیث قلم بند نہ ہوگی تو ایک نہ ایک دن مٹ جائے گی۔ قاتلھم اللہ انی یؤفکون[۲]۔

بریں عقل و دانش بباید گریست[۳]

حیرت اور سخت حیرت کا مقام ہے کہ منکرین حدیث مطبوعہ کتابوں سے قطع و برید کر کے عبارتیں نقل کر دیتے ہیں۔ جتنا لفظ ان کی غرض اور خواہش کے مطابق ہوتا ہے اتنا لے لیتے ہیں اور اس کے سیاق اور سباق کو حذف کر دیتے ہیں تاکہ کوئی صحیح مطلب نہ سمجھ سکے۔ قراطیس تبدونھا وتخفون کثیراً[۴]۔ غرض یہ کہ بعض صحابہ کتابت حدیث سے اس لیے منع کرتے تھے کہ وہ زبانی سلسلہ روایت کو پسند فرماتے تھے۔ نہ کہ

---

(۱) ابن حجر، فتح الباری۔ کتاب العلم، باب کتابۃ العلم ج۱: ص ۱۸۵

(۲) ۹: التوبہ: ۳۰

(۳) اسی عقل و دانش پر تو ماتم کرنا چاہیے

(۴) ۶: الانعام: ۹۱

اس وجہ سے کہ معاذاللہ حدیث نبوی ان کے نزدیک حجت نہیں تھی، اگر حجت نہیں تھی تو روایت ہی کیوں کرتے تھے جس چیز کی کتابت ناجائز ہے اس کی روایت بھی ناجائز ہونی چاہئیے۔ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ صحابہ کرام حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عاشق جان نثار تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پسینہ کے لیے اپنا خون بہاتے تھے۔ آپ کا تھوک اور سنک کبھی زمین پر نہیں گرا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تھوکتے تھے تو صحابہ کرام ہاتھوں ہاتھ اس کو لیتے اور اپنی آنکھوں سے ملتے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ عاشق اور محب صادق ہو اور اپنے معشوق اور محبوب کے کلام کو حجت نہ سمجھے۔ ایسا عاشق تو کبھی سننے ہی میں نہیں آیا کہ اپنے معشوق کے کلام کو اس لیے جلاتا یا مٹاتا ہو کہ کہیں لوگ محبوب کے قول پر عمل نہ کر بیٹھیں، اہل عقل اور اہل فہم پر مخفی نہیں کہ کسی مصلحت سے کسی شئے کا مٹانا یا جلانا اس کے غیر معتبر ہونے کی دلیل نہیں۔ یمحواللہ مایشاء اللہ ویثبت وعندہ ام الکتاب[1]. صحابہ کرام نے قرآن کریم کو جمع کرنے کے بعد اس کے سات نسخے نقل کراکر اطراف اور اکناف میں بھیجے اور جو مختلف نسخے لوگوں کے پاس تھے ان کو لے کر جلادیا[2] یہ جلادینا مصلحت کے لیے تھا کہ کوئی ملحد اور زندیق قرآن کریم میں ان منتشر اوراق میں کوئی لفظ کم و بیش کرکے امت میں

---

(۱) ۱۳: الرعد: ۳۹

(۲) امام بخاریؒ نے حذیفہ بن الیمان کی روایت انس بن مالک سے نقل کی ہے جس کے مطابق حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں ان نسخوں اور مجموعوں کو جلانے کا حکم دیا گیا جن میں صحابہ نے وہ سورتیں لکھی ہوئی تھیں جو انہیں یاد تھیں اور ان کی تلاوت ان کا معمول تھا ان مجموعات میں سورتوں کی اصل ترتیب کا بھی لحاظ نہ تھا۔ ان مجموعات کو جلانے کا حکم دیا گیا تاکہ کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔ دیکھیے بخاری، الجامع الصحیح (۴۷۰۲)، ج ۴: ص ۱۹۰۸، باب جمع القرآن، کتاب فضائل القرآن

فتنہ نہ برپا کردے۔ معاذاللہ اس لیے نہ تھا کہ قرآن حجت نہیں۔ صدیق اکبرؓ کا مجموعہ حدیث جلانا صدیق اکبرؓ کا پانچ سو حدیثوں کے مجموعہ کو جلانا بالفرض والتقدیر اگر کسی سند صحیح سے ثابت ہوجائے تو لامحالہ وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر ہوگا۔ اور وہ مصلحت خود اس روایت میں مذکور ہے۔ وہ یہ کہ مجھ کو مجموعہ پر اطمینان نہیں[1]۔ معلوم ہوا کہ یہ جلانا عدم اطمینان کی بنا پر تھا۔ اس بنا پر نہ تھا کہ ابوبکر صدیق حدیث نبوی کو حجت نہیں سمجھتے تھے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ابوبکر کے اس واقعہ کو نقل کرکے صاف لکھ دیا ہے لا یصح ذلک[2] یعنی یہ روایت صحیح نہیں منکرین حدیث تذکرۃ الحفاظ سے اس غیر معتبر روایت کو نقل کردیتے ہیں اور ھذا لایصح کا لفظ جو اسی روایت کے بعد متصلاً لکھا ہوا ہے۔ اس کو نقل نہیں کرتے۔ اور علیٰ ہذا اسی کے بعد حدیث نبوی کے مطابق جو فیصلہ کرنے کے واقعات تذکرۃ الحفاظ میں لکھے ہیں ان کو نقل نہیں کرتے۔ کیا یہ صریح خیانت اور تلبیس نہیں ہے اور بھلا اس بات کو کون دیوانہ قبول کرسکتا ہے کہ جو شخص نبی اکرم ﷺ کا رفیق، جان نثار اور یار غار ہو اور جس نے اپنا تمام جان و مال حضور پر نور ﷺ پر قربان اور نثار کردیا ہو، وہ حدیث نبوی کو حجت نہ سمجھتا ہو۔ خوب سمجھ لو کہ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ ابوبکر صدیقؓ حدیث نبوی کو حجت نہیں سمجھتے تھے، وہ بلاشبہ دیوانہ ہے اور جو اس مجنونانہ عقیدہ کی تصدیق کرے وہ اس سے بڑھ کر دیوانہ ہے "دیوانہ گفت ابلہ باور کرد" کی مثل اس پر صادق ہے۔

---

(۱) ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۱: ص ۵

(۲) حوالہ مذکور

فاروقِ اعظم رضؓ کا حدیثیں جلانا

عبد اللہ بن علاء کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد سے درخواست کی کہ مجھے کچھ حدیثیں لکھوا دیں تو محمد بن قاسم نے یہ کہا۔

ان الاحادیث كثرت علی عهد عمربن الخطاب فانشد الناس ان یاتوه بها فلما اتوه بها امر بتحریقها[1].

(کہ فاروق اعظم نے زمانہ میں لوگ احادیث کثرت سے بیان کرنے لگے (یعنی روایت میں احتیاط ملحوظ نہ رکھی) تو فاروق اعظم نے ان غیر محتاط لوگوں کو بلوایا کہ وہ کتابیں لے کر حاضر ہوں چنانچہ وہ لوگ اپنی کتابیں لے کر حاضر ہوئے تو ان کے جلانے کا حکم دیا)۔

فاروق اعظم کو جن لوگوں کے مجموعہ پر اطمینان نہ ہوا، اس کو منگا کر جلادیا۔ غرض یہ کہ صدیق اکبر اور فاروق اعظم کا کسی خاص مجموعہ کو جلانا اس لیے تھا کہ وہ خاص مجموعہ ان کی نظر میں معتبر اور مستند نہ تھا۔ ورنہ ابو بکر صدیق اور عمر کے نزدیک اگر حدیث نبوی معتبر نہ تھی تو خود کیوں حدیثوں کی روایت کرتے تھے۔ اور صحابہ سے کیوں دریافت کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بارہ میں کیا فرمایا اور جب کوئی حدیث معتبر ذریعہ سے ان کو معلوم ہوتی، فوراً اس پر عمل فرماتے۔

حدیث نبوی اور صحابہ رضؓ

(صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم رضؓ کی روایت حدیث میں احتیاط)

صدیق اکبر اور فاروق اعظم کا عام طور پر روایت حدیث سے منع

(۱) ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ج ۵: ص ۱۴۰

کرنا یا کسی روایت کرنے والے سے شاہد اور گواہ کا طلب کرنا احتیاط پر مبنی تھا۔ معاذاللہ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان حضرات کے نزدیک حدیث نبوی حجت نہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد دنیا صحابہ کرام پر پروانوں کی طرح گری اور ہر لمحہ اور ہر لحظہ یہی فکر تھی کہ یہ معلوم کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا فرمایا اور کیا کیا، دن رات یہی مشغلہ تھا کہ احادیث نبویہ کو سنتے اور یاد کرتے۔ صدیق اکبر اور فاروق اعظم نے حکم دیا کہ روایت کی کثرت سے پرہیز کریں اور احتیاط سے کام لیں اس لیے کہ کثرت روایت میں اندیشہ غلطی کا ہے۔

صدیق اکبرؓ کی احتیاط

(روایت حدیث میں صدیق اکبرؓ کی احتیاط)

حافظ شمس الدین ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں۔

وکان (ای ابوبکرؓ) اول من احتاط فی قبول الاخبار فروی ابن شهاب عن قبیصة بن ذویب ان الجدة جاءت الی ابی بکر تلتمس ان تورث فقال ما اجد لک فی کتاب الله شیئا و ما علمت ان رسول الله صلی الله علیه وسلم ذکر لک شیئا ثم سال الناس فقام المغیرة فقال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یعطیها السدس فقال له هل معک احد فشهد محمد بن مسلمة بمثل ذلک فانفذه لها ابوبکر[1].

(سب سے پہلے شخص جنہوں نے قبول روایت میں احتیاط کی سنت جاری کی وہ ابو بکر صدیقؓ ہیں جیسے کہ زہری قبیصہ سے راوی ہیں کہ ایک جدہ یعنی

(۱) ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج۱: ص ۳

دادی اپنے پوتے کی میراث مانگنے ابوبکرؓ کے پاس آئی۔ ابوبکر نے فرمایا کہ میں دادی کے متعلق نہ تو کتاب اللہ میں کوئی حکم پاتا ہوں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی فرمان مجھ کو اس بارہ میں معلوم ہے۔ بعد ازاں آپ نے لوگوں سے دریافت کیا تو مغیرہؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے سنا ہے کہ نبی کریم علیہ السلام جدہ (دادی) کو سدس۔ (چھٹا حصہ) دلواتے تھے۔ ابوبکرؓ نے فرمایا اور بھی کوئی اس پر شاہد ہے۔ محمد بن مسلمہ نے شہادت دی۔ آپ نے ان کی شہادت سن کر دادی کو چھٹا حصہ دینے کا حکم صادر فرمایا)۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ صدیق اکبر کو جب مسئلہ کا حکم کتاب اللہ میں نہ ملتا۔ تو حدیث نبوی کی طرف رجوع فرماتے اور جہاں مسئلہ حقوق کا ہوتا، وہاں بنظر احتیاط گواہ بھی طلب فرماتے اور شہادت کے بعد حدیث کے مطابق فیصلہ صادر فرماتے۔ مسند دارمی میں ہے۔

کان ابوبکر اذا ورد علیه الخصم نظر فی کتاب الله فان وجد فیه ما یقضی بینهم قضی وان لم یکن فی الکتاب وعلم من رسول الله صلی الله علیه وسلم فی ذلک سنة قضی به فان اعیاه ذلک خرج فسئال المسلمین[1].

(ابوبکر صدیقؓ کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو کتاب اللہ میں نظر فرماتے اگر اس میں حکم پاتے تو اسی کے موافق فیصلہ کرتے اور اگر کتاب اللہ میں اس کے متعلق حکم نہ ہوتا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے بارہ میں کوئی سنت معلوم ہوتی تو اس کے موافق فیصلہ فرماتے اور اگر حدیث اور سنت میں بھی اس کے متعلق کوئی نہ ملتا تو علماء

(۱) دارمی، مسند

اسلام سے رائے اور مشورہ لیتے اور اس کے مطابق فیصلہ فرماتے)۔

اس لیے کہ کتاب و سنت کے بعد درجہ اجماع کا ہے اور اجماع کا اتباع واجب ہے۔ ورنہ ہر شخص کا دین جدا ہوگا بلکہ دین دین نہ رہے گا، بازیچہ اطفال بن جائے گا۔ جس کا جو جی چاہے گا وہ کتاب و سنت کا مطلب قرار دے گا۔ اور دین کا لوگوں کی خواہش کے مطابق ہوجانا اس سے بڑھ کر کوئی فساد اور فتنہ نہیں۔

ولواتبع الحق اهواءهم لفسدت السموات والارض ومن فيهن[1]۔

(اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہوجائے تو زمین و آسمان اور جو ان کے درمیان ہے سب خراب ہوجاوے)۔

صدیق اکبرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلے جو خطبہ دیا اس میں یہ فرمایا۔

يا ايهاالناس قد وليت امركم ولست بخيركم ولكن نزل القرآن وسن النبى صلى الله عليه وسلم السنن فعلمنا وعلمنا ايها الناس انما انا متبع ولست بمبتدع فان احسنت فاعينونى وان زغت فقومونى[2]۔

(اے لوگو! میں تمہارا والی بنادیا گیا ہوں مگر میں تم سے بہتر نہیں لیکن خوب سمجھ لو کہ ہم میں قرآن اترا اور نبی کریم ﷺ نے ہم کو سنتیں اور طریقے سکھائے، جو ہم نے جانے اور سیکھے لہذا خیر اور بھلائی کتاب اور سنت ہی کے اتباع میں ہے۔ جز این نیست، کہ میں کتاب و سنت کا اتباع کروں گا دین میں کوئی نئی بات نہ نکال گا۔ اگر میں حضور ﷺ کے

---

(۱) ۲۳: المؤمنون: ۷۱

(۲) ابن سعد، محمد، الطبقات الکبریٰ ج ۲: ص ۱۲۹

طریقہ پر ٹھیک چلوں تو میرا اتباع کرو اور اگر ذرہ برابر اس سے انحراف کروں تو میری اصلاح کرو)۔

حضور ﷺ کی وفات کے بعد جب اختلاف ہوا کہ حضور ﷺ کو کہاں دفن کیا جائے تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا کہ جس جگہ اللہ کے نبی کی روح قبض ہوتی ہے اسی جگہ اس کو دفن کیا جاتا ہے[1]۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد جب حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے میراث مانگی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کے جواب میں حدیث پیش کی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ انبیاء کے مال کی میراث تقسیم نہیں ہوتی[2] ایک دو نہیں صدہا اور ہزارہا واقعات ایسے ہیں کہ جن سے صدیق اکبرؓ کا تمسک بالحدیث[3] بدرجۂ تواتر ثابت ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ بدرجۂ تواتر ثابت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے بلا تردد اور تامل اس کو قبول کیا اور کسی نے ذرہ برابر اختلاف نہیں کیا اور کسی وقت کسی کی زبان سے یہ نہیں نکلا کہ اے ابوبکر حدیث تو حجت نہیں تو پھر حدیث سے کیسے حجت قائم کرتے ہو۔ معلوم ہوا کہ حدیث کی حجیت صحابہ میں بالاجماع مسلم تھی۔ اور صحابہ کرامؓ کا اجماع دلیل قطعی ہے۔ منکرین حدیث آنکھ کھولیں اور ہوش میں آئیں۔

ومن مراسیل بن ابی ملکیۃ ان الصدیق جمع الناس بعد وفاۃ نبیھم

---

(۱) ترمذی، جامع الترمذی، ج۱: ص ۱۹۸- باب فی قتلی احد، ابواب الجنائز- ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ (۱۶۲۸)، ج۱: ص۵۲۱- باب ذکر وفاتہ ودفنہ صلی اللہ ﷺ، کتاب الجنائز۔

(۲) ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ج۵: ص۲۴۹

(۳) تمسک بالحدیث: حدیث پر عمل

فقال انکم تحدثون عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم احادیث تختلفون فیھا والناس بعد اشد اختلافا فلاتحدثوا عن رسول اللّٰہ شیئا فقولوا بیننا و بینکم کتاب اللّٰہ فاستحلوا حلالہ وحرموا حرامہ فھذا المرسل یدلک ان مراد الصدیق التثبت فی الاخبار والتحری لاسدباب الروایۃ الاتراہ انہ لما نزل بہ امرا بجدۃ ولم یجدہ فی الکتاب کیف سال عنہ فی السنن فلما اخبرہ الثقۃ ما اکتفی حتی استظھر بثقۃ اخر ولم یقل حسبنا کتاب اللّٰہ کما تقولہ الخوارج[1].

(ابن ابی ملیکہ کی مرسل روایت[2] میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کرکے کہا کہ تم اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں بیان کروگے (اس میں انتہائی احتیاط سے کام لینا) عجب نہیں کہ تم ان روایات میں مختلف ہوجاؤ یعنی کوئی کسی طرح روایت کرے اور کوئی کسی طرح، پس اگر تم نے احتیاط نہ کی اور تمہاری روایات اور بیانات میں اختلاف ہوا تو تمہارے بعد آنے والے تم سے زیادہ مختلف ہوں گے لہذا بغیر پورے اطمینان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث روایت نہ کرنا اور اگر تمہاری روایتوں میں کسی وقت اختلاف پیش آئے تو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ یوں کہہ دینا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب موجود ہے اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ صدیق اکبرؓ کا مقصود یہ ہے کہ احادیث کے روایت میں تثبت اور احتیاط لازم ہے روایت کا دروازہ بند

(۱) مرسل کی تعریف کے لیے دیکھیے حوالہ نمبر ۲۴

(۲) ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۱: ص ۳

کرنا مقصود نہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب صدیق اکبرؓ سے جدہ یعنی دادی کے متعلق دریافت کیا گیا اور اس کا حکم کتاب اللہ میں نہ پایا تو کس طرح اس کے متعلق احادیث نبویہ کو دریافت کیا اور جب ایک ثقہ اور معتبر آدمی یعنی حضرت مغیرہؓ نے اس بارہ میں حدیث نبوی کی خبر دی تو اس پر اکتفا نہ فرمایا بلکہ بنظر احتیاط ایک دوسرے ثقہ اور معتبر یعنی محمد بن مسلمہؓ سے اس کی تصدیق اور توثیق طلب کی اور یہ نہیں فرمایا کہ ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے جیسا کہ خوارج کہتے ہیں)[1]۔

فاروق اعظمؓ کی احتیاط

(روایت حدیث میں فاروق اعظمؓ کی احتیاط)

یہ تو ہم نے صدیق اکبر کے متعلق ذکر کیا اب ہم فاروق اعظمؓ کے متعلق عرض کرتے ہیں کہ وہ روایت حدیث کے بارہ میں کس درجہ محتاط تھے۔ حافظ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں فاروق اعظم کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

فیا اخی ان احببت ان تعرف هذا الامام حق المعرفة فعلیک بکتابی نعم السمر فی سیرة عمر فانه فارق فیصل بین المسلم والرافضی فواللہ مایفض من عمر الاجاهل وایص او رافضی مفاجر واین مثل ابی حفص فما دار الفلک علی مثل شکل عمرؓ وهوالذی سن للمحدثین التثبت فی النقل

---

(۱) منکرین حدیث صدیق اکبرؓ کے ان کے اقوال کے اقتباسات، سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے نقل کرتے ہیں جس سے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ صدیق اکبر حدیث کو مصدر قانون نہ سمجھتے تھے، حدیث کی عظمت کے قائل نہ تھے یا کم از کم روایت حدیث کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے جبکہ ان روایات کو اپنے صحیح پس منظر میں دیکھ کر معلوم ہوا کہ صدیق اکبر نے حدیث کی عظمت ہی کی وجہ سے یہ احکام صادر فرمائے۔

وربما كان يتوقف في خبرالواحد اذا ارتاب[۱].

(اے برادر عزیز اگر تو اس خلیفہ اعظمؓ یعنی عمرؓ کو کما حقہ جاننا اور پہچاننا چاہتا ہے تو میری کتاب (نعم السمر فی سیرة عمر) کا مطالعہ کرو۔ بلاشبہ فاروق اعظمؓ کا وجود مسلمان اور کافر اور سنی اور رافضی کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ عمر فاروقؓ کی تنقیص سوائے جاہل اور منحرف عن الحق اور بدکار رافضی کے کوئی کر ہی نہیں سکتا اور دنیا میں عمر جیسا ہے کون۔ فلک نے عمر جیسے پر حرکت نہیں کی۔ عمر ہی نے محدثین کے لیے نقل میں تثبت اور روایت میں احتیاط کی سنت جاری کی ہے، بعض اوقات خبر واحد کے بارہ میں اگر کوئی تردد یا شبہ پیش آتا تو اس کے قبول کرنے میں توقف فرماتے)۔

چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ابوموسیٰ اشعریؓ آئے اور تین مرتبہ دروازے کے پیچھے سے فاروق اعظمؓ کو سلام کیا مگر جب جواب نہ ملا تو واپس ہوگئے۔ جب حضرت عمرؓ کو علم ہوا تو فوراً بلانے کے لیے قاصد روانہ کیا۔ ابوموسیٰ اشعریؓ واپس آئے۔ فاروق اعظمؓ نے دریافت کیا۔ لم رجعت۔ کیوں واپس ہوئے ابوموسیٰؓ نے جواب دیا۔

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ذا سلم احدكم ثلاثا فلم يجب فليرجع قال لتاتيني على ذلك ببينة اولا فعلن بك فجاءنا ابو موسىٰ منتقعالونه ونحن جلوس فقلنا ما شانك فاخبرنا وقال فهل سمع احد منكم فقلنا نعم كلنا سمعه فارسلوا معه رجلا منهم حتى اتى عمر فاخبره[۲].

(۱) ذہبی، تذکرة، ج۱: ص۶ (۲) حوالہ مذکور

(کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جب کوئی شخص تین بار سلام کرلے اور اس کو جواب نہ ملے تو واپس چلا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم اس پر کوئی گواہ لاؤ ورنہ میں تمہارے ساتھ سخت معاملہ کروں گا صحابہ کہتے ہیں کہ ابوموسیٰ ہمارے پاس آئے اور ان کے چہرے کا رنگ فق تھا ہم نے پوچھا کیا ہوا ابوموسیٰؓ نے واقعہ بیان کیا اور یہ کہا کہ تم میں سے بھی کسی نے اس حدیث کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا ہے؟ ہم نے کہا کہ ہم میں سے ہر شخص نے اس حدیث کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے اور ایک آدمی ابوموسیٰؓ کے ساتھ کردیا جس نے جاکر حضرت عمرؓ کو اس کی خبر دی)۔ حافظ ذہبیؒ اس واقعہ کو نقل کرکے لکھتے ہیں۔

احب عمران یتاکد عنده خبر ابی موسی بقول صاحب اخر ففی هذا دلیل علی ان الخبر اذا رواه ثقتان کان اقوی وارجح مما انفردبه واحد وفی ذلک حض علی تکثیر طرق الحدیث لکے یرتقی عن درجة الظن الی درجة العلم اذا لواحد یجوز علیه النسیان والوهم ولایکاد یجوز ذلک علی ثقتین لم یخالفهمااحد وقد کان عمر من دجله ان یخطئی الصاحب علی رسول الله صلی الله علیه وسلم یامرهم ان یقلوا الروایة عن نبیهم صلی الله علیه وسلم ولئلا یتشاغل الناس بالاحادیث عن حفظ القرآن و قد روی شعبة وغیره عن بیان عن الشعبی عن قرظة بن کعب قال لما سیرنا عمر الی العراق مشی معنا عمر وقال اتدرون لما شیعتکم قالوا نعم مکرمه لنا قال و مع ذلک انکم تاتون علی قریه لهم بالقرآن کدوی النحل فلا تصدوهم بالاحادیث فتشغلوهم جودوا القرآن واتلوا الروایة عن رسول الله وانا شریککم فلما قدم قرظة بن کعب قالوا حدثنا فقال نهانا عمرؓ[1]

(۱) ذہبی، تذکرہ، ج ۱: ص ۷

(کہ حضرت عمرؓ کا منشا یہ تھا کہ ابوموسیٰ اشعریؓ کی حدیث کسی دوسرے صحابی کی روایت سے مل کر خوب محکم اور پختہ ہوجائے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کسی حدیث کو دو ثقہ راوی روایت کریں تو وہ حدیث اس حدیث سے زیادہ قوی اور راجح ہوتی ہے کہ جس کو فقط ایک راوی روایت کرے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کا مقصود یہ تھا کہ لوگوں کو روایت حدیث میں اس طرف مائل کریں جس قدر ممکن ہو حدیث کے طرق کثیرہ اور اسانید متعددہ کو جمع کریں تاکہ روایت درجہ ظن سے ترقی کرکے درجہ علم تک پہنچ جائے اس لیے کہ ایک شخص پر وہم اور نسیان ممکن ہے۔ مگر ایسے دو ثقہ آدمی کہ کوئی ان کی مخالفت اور تردید نہ کرے۔ ان پر خطا اور وہم کا احتمال عادتاً بہت مستبعد ہے نیز حضرت عمرؓ اس سے غایت درجہ خائف رہتے تھے کہ کوئی صحابی رسول اللہ ﷺ کی طرف کوئی غلط بات منسوب کردے۔ اس لیئے صحابہ کو حکم دیتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو آنحضرت ﷺ سے کم روایت کریں نیز حضرت عمر کو یہ بھی اندیشہ رہتا تھا کہ لوگ روایت حدیث میں اتنے مشغول نہ ہوجائیں کہ قرآن سے غافل ہوجائیں۔ (حفظ مراتب ضروری ہے۔ اول قرآن، بعدہ حدیث) (حکایت) قرظہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے جب ہم کو عراق کی طرف روانہ کیا تو بطور مشایعت کچھ دور تک ہمارے ساتھ چلے اور فرمایا کہ معلوم بھی ہے کہ میں کیوں تمہاری مشایعت کے لیے نکلا؟ ہم نے عرض کیا کہ ہماری عزت افزائی کے لیے فرمایا ہاں اس لیے بھی اور اس وجہ سے بھی کہ تم کو یہ بتلادوں کہ تم ایسے مقام پر جارہے ہو کہ جہاں کے باشندوں کے قرآن پڑھنے کی آوازیں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی ہیں۔

تم ان کو احادیث میں لگا کر قرآن سے غافل نہ کرنا قرآن کو خوب اچھی طرح سے پڑھو اور حدیث کی روایت کم کرو میں بھی قلت روایت میں تمہارا شریک ہوں یعنی میں بھی کم روایت کرتا ہوں قرظہ عراق پہنچے تو لوگوں نے ان سے حدیث بیان کرنے کی درخواست کی۔ قرظہ نے جواب دیا کہ ہم کو حضرت عمرؓ نے منع کیا ہے)[۱]۔

حضرت عمرؓ کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی مشغولی کو مقدم رکھو۔ روایت حدیث میں اس درجہ مشغولی نہ ہو کہ قرآن چھوٹ جائے اور حدیث کی روایت میں احتیاط کرنا۔ کثرت سے روایت نہ کرنا بلکہ روایت کم کرنا اس لیے کہ کثرت روایت خلاف احتیاط ہے۔

معاذاللہ یہ مطلب نہ تھا کہ حدیث نبوی حجت نہیں اور حدیث کی روایت کرنا گناہ ہے۔ ورنہ اگر یہ معنیٰ ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ زیادہ گناہ مت کرنا تھوڑا کرنا اور تھوڑا گناہ کرنے میں میں بھی تمہارا شریک ہوں۔

حضرت عمرؓ کا طرز عمل

کتب احادیث، کتب سیر اور تاریخ کے دیکھنے سے یہ حقیقت آفتاب کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ فاروق اعظمؓ کا اپنی تمام زندگی یہ طرز عمل رہا کہ کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع

(۱) فاروق اعظمؓ کے اس فرمان سے بھی منکرین حدیث یہ استنباط کرتے ہیں کہ فاروق اعظمؓ روایت حدیث کے مخالف تھے حالانکہ واقعۃً ایسا نہیں ہے بلکہ وہ روایت حدیث میں سخت احتیاط کے قائل تھے کہ جو بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کی جارہی ہے اس میں جھوٹ کا ادنیٰ سا بھی احتمال نہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر فرمان حجت اور قانون ہے۔ دوسرے یہ مقصود تھا کہ حدیث کی حجیت و عظمت اپنی جگہ لیکن قرآن کریم کا مقام حدیث سے مقدم اور معظم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ حدیث میں اس قدر مشغولیت ہوجائے کہ اس سے قرآن کی عظمت متاثر ہو۔

فرماتے اور اگر کتاب و سنت میں وہ مسئلہ نہ ملتا تو صحابہ سے دریافت فرماتے کہ ابوبکر صدیقؓ نے اس بارہ میں کیا فیصلہ فرمایا۔ اگر ابوبکر صدیقؓ کا فیصلہ مل جاتا تو پھر وہ فیصلہ فرماتے اور اس سے عدول نہ فرماتے اور ابوبکرؓ کے اتباع کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے حافظ ابن قیمؒ اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں۔

وکان عمر یفعل ذلک فاذا اعیاه ان یجد ذلک فی کتاب اللّٰہ والسنة سأل هل کان ابوبکر قضی فیه بقضاء فان کان لابی بکر قضاء قضیٰ به والاجمع علماء الناس و استشارهم فاذا اجتمع الیهم علی شئی قضی به[1].

(حضرت عمرؓ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے جیسا کہ ابوبکرؓ کرتے تھے کہ اول کتاب اللہ کو لیتے پھر حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لیتے اور اگر کتاب و سنت میں کچھ نہ ملتا تو دریافت کرتے کہ ابوبکر صدیقؓ نے اس بارہ میں کوئی فیصلہ صادر فرمایا ہو تو بتلاؤ۔ اگر ابوبکر صدیقؓ کا کوئی فیصلہ مل جاتا تو فاروق اعظمؓ اسی کے مطابق فیصلہ صادر فرماتے اور اگر ابوبکرؓ کا بھی کوئی فیصلہ نہ ملتا تو علماء صحابہ کو جمع کر کے مشورہ فرماتے جس بات پر ان کی رائے متفق ہوجاتی اسی کے موافق فیصلہ فرماتے)۔

معلوم ہوا کہ اہل الرائے کا فیصلہ معتبر اور حجت ہے نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ فاروق اعظمؓ۔ سنت نبوی کے بعد سنت ابی بکرؓ کے اتباع کو اپنے لیے لازم اور ضروری سمجھتے تھے اور ان کے فیصلہ کے بعد کسی اور فیصلہ کی طرف نظر نہیں فرماتے تھے۔ اور ابوبکرؓ کے فیصلہ کا اتباع تمام

(۱) ابن قیم الجوزی، اعلام الموقعین ج۱: ص ۷۱

صحابہ کرام کے مشورہ سے ہوتا تھا معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کی نظر میں تنہا ابوبکر صدیقؓ کا فیصلہ بھی حجت اور سند تھا۔

غرض یہ کہ اس قسم کے شواہد کتب احادیث اور سیر میں بے شمار ہیں۔ عاقل کے اشارہ کے لیے دو چار نقل کردیئے ہیں۔

منکرین حدیث بتلائیں

کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کتاب اللہ کے بعد جس سنت کو اپنے لیے مشعل ہدایت اور اس کے اتباع کو موجب سعادت سمجھتے تھے وہ کون سی سنت تھی۔ کیا وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت نہ تھی[1]۔

حضرت علیؓ کی روایت حدیث میں احتیاط

ابوبکر صدیقؓ اور فاروق اعظمؓ کی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی روایت حدیث میں غایت درجہ محتاط تھے۔ حافظ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں۔

وکان (ای علی کرم اللّٰہ وجھہ) اماما متحریا فی الاخذ بحیث انہ یستحلف من یحدثہ بالحدیث[2].

---

(۱) حافظ ابن کثیرؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ جس کے مطابق فاروق اعظمؓ نے اس منافق کی گردن اڑادی تھی جو نبی کریم ﷺ کے فیصلہ پر فاروق اعظم سے رائے طلب کرنے آیا تھا۔ اور اسی پر یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ فلاوربک لایؤمنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم۔ دیکھیے ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم ج۱: ص۵۲۱ ۔ حضرت عمر صحابہ کے اتباع کی مثال بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ سونے کی انگوٹھی پہنی تو صحابہ نے پہن لی۔ پھر آپ ﷺ نے اسے اتار دیا اور فرمایا کہ آئندہ میں سونے کی انگوٹھی نہیں پہنوں گا، صحابہ نے بھی اتار دیں۔ دیکھیے بخاری، الجامع الصحیح ج۹: ص۱۱۹۔ کتاب الاعتصام بالسنۃ . باب الاقتداء بافعال النبیؐ.

(۲) ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج۱: ص۱۰

(حضرت علی کرم اللہ وجہ روایت کے قبول کرنے میں اس درجہ محتاط تھے کہ حدیث بیان کرنے والے سے قسم لیا کرتے تھے)[1]۔

خلاصۂ کلام

یہ کہ منکرین حدیث کا یہ کہنا کہ خلفاء راشدین حدیث نبوی کو حجت نہیں سمجھتے تھے، سفید جھوٹ اور صریح بہتان ہے اور دنیا کی تاریخ اس کی تکذیب کرتی ہے۔

حدیث نبوی ﷺ کا سلسلہ روایت اور اس کی صحت و ثقاہت

حدیث نبوی ﷺ کی سلسلہ روایت کی پہلی لڑی حضرات صحابہ کرام ہیں جن کی صداقت اور عدالت میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا اور نہ ان میں کوئی جرح اور تعدیل جاری ہوسکتی ہے۔ بارگاہ خداوندی سے صحابہ کرام کی عدالت و صداقت پر مہر ہوچکی ہے سارا قرآن صحابہ کی مدح اور ثناء سے بھرا پڑا ہے اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

بفرض محال اگر صحابہ کرام میں ہزار عیب ہوں تو جب خداوند ذوالجلال ان سے راضی ہے تو ان کا ہر عیب ہنر اور کمال ہے۔

ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد ھنراست

---

(۱) حضرت علی کو جب آپ ﷺ نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو آپؓ نے عرض کیا کہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق فیصلہ کرونگا۔ اس پر آپ خوش ہوئے۔ امام بخاری کے مطابق حضرت علی کے پاس تحریری شکل میں ایک مجموعہ حدیث تھا قرآن کریم کے بعد وہ اس مجموعہ حدیث کو سب سے زیادہ عظمت والا سمجھتے تھے۔ دیکھیے بخاری، الجامع الصحیح، ج۴: ص۱۲۲۔ کتاب الجہاد، باب ذمة المسلمین.

علاوہ ازیں صحابہ کرام کی اسلام کی راہ میں بے مثال نصرت، حمایت، جہاد، ہجرت، وطن اور خاندان کی مفارقت، معرکہ جہاد میں آباء اور اولاد کا قتل اور ہر وقت اللہ اور اس کے رسول کے عشق میں سرشار اور دنیا اور مافیہا سے بیزار یہ سب احوال ان کی عدالت، ثقاہت، کمال ایمان اور کمال معرفت پر شاہد عادل ہیں اگر یہ پاکباز اور راستباز گروہ عادل نہیں پھر دنیا میں کون سا گروہ ہے جو عادل کہلا سکے؟۔

حضرات صحابہ کرام کی خصوصیات

اس وقت ہم حضرات صحابہ کرام کی چند خصوصیات ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جس سے حضرات صحابہ کرام کی روایت کی وثاقت اور حجیت کا پایہ معلوم ہو۔

۱۔ حضرات صحابہ نے نبی اکرم ﷺ کے جمال بے مثال کے مشاہدے سے اپنی آنکھوں کو منور کیا اور اپنے دلوں کو ایمان اور اطاعت سے روشن کیا۔

۲۔ صحابہ کے سامنے قرآن کریم کا نزول ہوا اور جن حالات اور واقعات میں آیات قرآنیہ کا نزول ہوا۔ وہ تمام صحابہ کے سامنے تھے۔

۳۔ صحابہ کرام قرآن کریم کے اولین مخاطب ہیں۔

۴۔ صحابہ کرام نے بلاواسطہ نبی کریم علیہ السلام سے قرآن کریم کو سنا اور ایسا یاد کیا کہ اس کا ایک حرف اور ایک نقطہ بھی ضائع نہیں ہونے دیا اور بلاکم و کاست امت تک پہنچا دیا۔

۵۔ قرآن کریم کی جمع، ترتیب اور بشکل مصحف اس کی کتابت، یہ خدمت بھی حضرات صحابہ کے ہاتھ سے پوری ہوئی اگر حضرات صحابہ قرآن کریم

لو جمع اور مرتب نہ کرتے تو اس وقت تمام دنیا قرآن کریم کی، دولت عظمیٰ سے محروم ہوتی۔

۶۔ صحابہ کرام نے قرآن کریم کے بعد حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر قول، ہر فعل اور ہر حرکت و سکون کو الواح قلوب پر کندہ کیا، دل سے یاد رکھا، زبان سے ان کو بیان اور اعضاء اور جوارح سے ان پر عمل کیا۔ اور جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہتے اور کرتے دیکھا تھا اس کو بعینہ اسی طرح لوگوں کے سامنے کہہ کے اور کر کے دکھلادیا، حضرات صحابہ حضور کے اقوال و افعال کو فقط زبان ہی سے روایت نہیں کرتے تھے بلکہ عملی طور پر ان امور کو کر کے بھی دکھلاتے تھے الغرض قول اور فعل دونوں طریق سے روایت کا سلسلہ جاری تھا[1] یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ دین کی روایت فقط قولی نہیں بلکہ قولی اور عملی دونوں طریق سے مروی ہے، سوائے اسلام کے اور کسی امت میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ اس نے اپنے پیشوا کے اقوال و افعال کو قولاً و عملاً دونوں طرح سے روایت کیا ہو۔ اور جس طرح عہد نبوت میں قرآن کریم کی تحفظ کا زیادہ تر دارومدار صحابہ کرام کی یادداشت پر تھا اسی طرح احادیث نبوی کے تحفظ اور انضباط کا دارو مدار بھی صحابہ کی یاد داشت ہی پر تھا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد صدیق اکبر، فاروق

---

(۱) حضرت عمر فاروقؓ صحابہ کی اتباع کی ایک اجتماعی مثال پیش کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ سونے کی انگوٹھی پہنی تو لوگوں نے بھی سونے کی انگوٹھی پہن لیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں نے سونے کی انگوٹھی لی تھی، پھر آپ نے اسے اتاردیا اور فرمایا کہ آئندہ میں اسے ہرگز نہ پہنوں گا تو تمام لوگوں نے اپنی انگوٹھیاں اتادیں۔ دیکھیئے بخاری، الجامع الصحیح ج۹: ص۱۱۹۔ کتاب الاعتصام بالسنۃ، باب الاقتداء بافعال النبیؐ. مدینہ کی گلیوں میں شراب بہنا، ایک ہی نماز آدھی بیت المقدس اور آدھی بیت اللہ کی طرف منہ کر کے پڑھنا اسی اتباع کی مثالیں ہیں۔

اعظم و صحابہ کرام کو حافظ قرآن کے فوت ہوجانے سے قرآن کریم کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوا اور تمام صحابہ نے مل کر قرآن کریم کو بشکل مصحف جمع کیا، اسی طرح جب صحابہ کرام دنیا سے رخصت ہوئے تو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اموی کو احادیث کے ضائع ہونے کا خیال پیدا ہوا، اس لیے انہوں نے اپنے زمانہ کے محدثین کے نام فرمان جاری کیا کہ احادیث نبوی کو کتابی شکل میں مدون کریں، فرمان جاری ہونا تھا کہ تدوین حدیث کا سلسلہ شروع ہوا اورایک صدی گذرنے نہ پائی کہ تدوین حدیث مکمل ہوگئی اگر صحابہ کرام کی جمع کردہ روایتوں کے غیر معتبر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عہد نبوی میں جمع نہیں ہوئی تو پھر قرآن کریم بھی عہد نبوی میں جمع نہیں کیا گیاوہ بھی غیر معتبر ہونا چاہیئے۔

۷۔ صحابہ کرام نے حضور پر نور ﷺ کی محبت میں ہجرت کی، اہل و عیال، خویش واقارب اور مال و دولت سب کو خیر باد کہا، ہر معرکہ قتال میں آپ کے ہمرکاب رہے، آپ کی محبت میں عرب اور عجم سب سے جنگ مول لی اور آپ کی نصرت و حمایت میں اپنے خویش و اقارب سے جنگ کی، آپ کے مقابلے میں باپ، بیٹے، چچا اور ماموں کی بھی پرواہ نہ کی۔

۸۔ صحابہ کرام ہی نے تمام دنیامیں اسلام کا جھنڈا بلند کیا اور کتاب وسنت کی نشرواشاعت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا ابتداء میں جو بھی مسلمان ہوا وہ صحابہ ہی کو دیکھ کر ہوا۔

۹۔ صحابہ کرام ہی نے قیصر اور کسریٰ کی سلطنت کا تختہ الٹا، اسلام کے زیر نگیں بنایا اور ایسا عدل وانصاف جاری کیا کہ دنیا ان کے عدل کو دیکھ کر حیران اور دنگ رہ گئی، پھر خلفاء راشدین اور ان کے حکام کو دیکھیئے کہ

باوجود حاکم اور فرماں روا ہونے کے نماز، روزہ تلاوت قرآن اور تسبیح و تہلیل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور زہد کا یہ عالم تھا کہ باوجود اس حکمرانی کے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے کوئی ذخیرہ نہیں جمع کیا۔ شان و شوکت اور عدل و انصاف سب امیرانہ اور شاہانہ تھا مگر زندگی تمام تر درویشانہ اور فقیرانہ تھی۔

۱۰۔ قرآن کریم میں مومنین، مسلمین، متقین، صادقین، صالحین، قانتین، صابرین اور شاکرین وغیرہ وغیرہ اس قسم کے جتنے اوصاف بھی آئے ہیں ان سب کا اولین مصداق حضرات صحابہ کرام ہیں اور باقی امت۔ ان کی تبعیت[1] میں ان اوصاف کی مصداق ہے۔ فتلک عشرۃ کاملۃ.

یہی وجہ ہے کہ امت محمدیہ کے علماء نے رواۃ[2] کی طرح حضرات صحابہ کے جرح و تعدیل[3] پر کبھی کوئی بحث نہیں کی اور بلاکسی تحقیق اور تنقید کے صحابہ کی روایات کو قبول کیا۔ یہ امر حضرات صحابہ کے عادل اور ثقہ ہونے کی دلیل قطعی ہے۔ نیز اگر صحابہ کی عدالت اور ان کی روایت کی صحت اور وثاقت تسلیم نہ کی جائے تو دین اور شریعت عہد نبوت میں منحصر ہو کر رہ جائے گی یعنی جب تک حضور ﷺ دنیا میں رہے اس وقت تک دین اسلام اور شریعت موجود رہی اور آپ کے وصال کے بعد دین اور شریعت سب ختم ہوگئی اس لیے کہ دین اسلام اور شریعت محمدیہ کے راوی صحابہ کرام ہیں اور منکرین حدیث کے نزدیک

---

(۱) تبعیت: پیروی

(۲) رواۃ: راوی کی جمع

(۳) جرح و تعدیل: راویان حدیث سے متعلق تحقیق کے بعد ان کی طرف سے روایت کو قبول کرنا تعدیل۔ اور رد کرنا جرح کہلاتا ہے۔

صحابہ کی روایت حجت اور معتبر نہیں اس لیے منکرین حدیث کے نزدیک صحابہ کرام دروغ گو اور ناقابل اعتبار ہیں۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

سلسلۂ روایت کی دوسری لڑی

حضرات تابعین ہیں جو والذین اتبعوھم باحسان کا مصداق ہیں یہ طبقہ اگرچہ صحابہ کرام کے ہم مرتبہ نہیں مگر ان کا نمونہ ضرور ہے اور صحابہ کا رنگ اور ان کی خو اور بولے ہوئے ہے اس طبقہ میں کچھ فاسق اور فاجر بھی ہوئے مگر کم، غلبہ صلاح اور تقویٰ، امانت اور دیانت ہی کا رہا۔ اسی دور میں آکر کتابی شکل میں تدوین حدیث کی بنیاد رکھی گئی احادیث نبوی کے بہت سے متفرق مجموعے حضور پر نور کی زندگی ہی میں لکھے جا چکے تھے[1] اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ اور تابعین بطور خود بھی احادیث نبویہ لکھتے رہے۔ سنہ ۹۹ھ میں عمر ثانی یعنی عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب یہ دیکھا کہ صحابہ کرام جو آسمان ہدایت کے نجوم اور ستارے تھے، وہ تقریباً تمام تر دنیا سے رخصت ہو گئے اور علماء تابعین بھی ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں تو گھبرا کر علماء تابعین کے نام فرمان جاری کیا کہ احادیث نبویہ کو تلاش کر کے کتابی شکل میں مدون اور مرتب کیا جائے اس لیے کہ اس وقت تو احادیث نبویہ کا جمع کرنا بہت آسان ہے ہزاروں بلکہ

---

(۱) اب تک کی تحقیق سے عہد صحابہ کے کم و بیش ۴۰ مجموعات حدیث کا انکشاف ہو چکا ہے جو صحابہ نے خود تحریر کیے اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے املاءت ہیں اور کچھ ایسے بھی تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حیوۃ مبارکہ میں بھی موجود تھے۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے عجاج الخطیب، محمد، السنۃ قبل التدوین، قاہرہ، مکتبہ وھبہ، ۱۹۶۳ ص ۳۴۳۔ حمید اللہ، ڈاکٹر، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، قاہرۃ، لجنۃ التالیف، ۱۹۴۱، ص ۱۰۴ تا ۱۰۹

لاکھوں صحابہ کے دیکھنے والے موجود ہیں، ہمارے اور صحابہ کرام کے درمیان ایک ہی واسطہ ہے جو ہماری نظروں کے سامنے ہے اور ہم اس سے بخوبی واقف ہیں لہذا جو احادیث ہم تک معتبر اور ثقہ راویوں سے پہنچی ہیں ان کو لکھ لیا جائے۔

وعن سعد بن ابراهيم قال امرنا عمربن عبدالعزيز بجمع السنن فكتبناها دفترا دفترا فبعث الى كل ارض له عليها سلطان دفترا و عن الزهرى قال كنا نكره كتاب العلم حتے اكرهنا عليه هوءلاء الامراء فراينا ان لا نمنعه احدا من المسلمين[1].

(سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے ہم کو احادیث نبوی کی کتابت کا حکم دیا ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔ عمر بن عبدالعزیز نے ایک ایک دفتر ہر اس شہر میں بھیج دیا جہاں کوئی بڑا فرمانروا اور صوبہ کا والی تھا۔ زہری کہتے ہیں کہ ہمیں علم کی کتابت شاق اور گراں تھی (اس لیے کہ ہم حفظ اور زبانی روایت کے عادی تھے) یہاں تک کہ ان امراء نے ہم کو کتابت حدیث پر مجبور کیا۔ پھر ہماری بھی یہی رائے ہوئی کہ حدیث کو مسلمانوں سے روکیں نہیں یعنی جس طرح بھی حدیث نبوی کا مسلمانوں میں پہنچانا ممکن ہو، اس سے دریغ نہ کریں خواہ کتابت کے ذریعہ سے پہنچائیں یا روایت کے ذریعہ سے)۔

امام زہریؒ۔ بالاتفاق تابعی تھے دس صحابہ کو دیکھا تھا سنہ ۵۲ھ یا سنہ ۵۳ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۴ یا سنہ ۱۲۵ میں بہتر سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ علم، حفظ، ضبط، اتقان، عبادت اور ورع میں بے نظیر

(۱) ابن عبدالبر اندلسی، جامع بیان العلم، ص ۳۸

تھے[۱]۔

وعن محمد بن علی قال سمعت خالد بن خداش قال ودعت مالک بن انس فقلت یا ابا عبداللہ اوصنی قال علیک بتقوی اللہ فی السر والعلانیة والنصح لکل مسلم وکتابت العلم من عند اھلہ۔

وعن ابی زرعة قال سمعت احمد بن حنبل ویحیی بن معین یقولان کل من لا یکتب العلم لایومن علیہ الغلط وعن اسحاق بن منصور قال قلت لاحمد بن حنبل من کرہ کتابة العلم قال کرھہ قوم ورخص فیہ آخرون قلت لہ لو لم یکتب العلم لذھب قال نعم لولا کتابة العلم ای شئی کنا نحن قال اسحاق وسالت اسحاق بن راھویة فقال کما قال احمد سواء[۲]۔

(خالد بن خداش کہتے ہیں کہ میں جب امام مالک سے رخصت ہونے لگا تو عرض کیا کہ مجھ کو کچھ نصیحت فرمائیے تو یہ نصیحت فرمائی کہ ظاہر و باطن میں اللہ کے تقویٰ کو لازم پکڑو۔ اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرو اور علم کی جو بات اہل علم سے سنو وہ لکھ لیا کرو۔

ابوزرعہ کہتے میں نے احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کو یہ کہتے سنا کہ جو علم کی کتابت نہیں کرتا اس کا علم قابل اطمینان نہیں اور غلطی سے محفوظ نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے علم کی کتابت کو

---

(۱) عہد حاضر کے کچھ دانشور زہری پر تنقید کرتے ہیں، ان پر تشیع کا الزام لگاتے ہیں اور اس سلسلہ میں دوسری صدی ہجری کے بعض ماہرین جرح و تعدیل کا قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی زہری کو شیعہ کہا ہے۔ لیکن یہ وضاحت نہیں کرتے کہ اس زمانہ میں کسی کے رفض کے طرف مائل ہونے کا مطلب دیگر صحابہ کے مقابلہ میں اہل بیت سے زیادہ محبت تھی۔ رافضیت کے وہ نظریات و عقائد اور اعمال و افکار جو ہدف تنقید بنتے ہیں، اس دور کی پیداوار ہیں ان چیزوں کا اس وقت تصور بھی نہ تھا۔

(۲) ابن عبدالبر، حوالہ مذکور

ناپسند کیا اور بعض نے اجازت دی حق یہ ہے کہ اگر علم نہ لکھا جاتا ہم کچھ بھی نہ ہوتے اور اسحاق بن راہویہ نے بھی ایسا ہی فرمایا)۔

نکتہ

عمر اول (فاروق اعظمؓ) کے اشارہ اور مشورہ سے خلافت راشدہ کے زیر اہتمام قرآن کریم بشکل مصحف جمع اور مرتب ہو کر شائع ہوا۔ اور عمر ثانی (عمر بن عبدالعزیزؒ) کے اشارہ اور حکم سے حدیث نبوی کے مجموعے مدون اور مرتب ہو کر شائع ہوئے۔ جس طرح قرآن کریم اصل ہے اور حدیث نبوی ﷺ اس کے تابع ہے اسی طرح سلسلہ روایت میں صحابہ کرامؓ اصل ہیں اور تابعین صحابہ کے تابع ہیں۔ اس لیے من جانب اللہ قرآن کریم کی جمع و ترتیب صحابہ کے ہاتھ سے ہوئی اور حدیث نبوی ﷺ کی تدوین تابعین کے ہاتھ سے ہوئی، اصل اصل کے ہاتھ سے جمع ہوا (یعنی قرآن کریم صحابہ کے ہاتھ سے جمع ہوا) اور تابع تابع کے ہاتھ سے مدون ہوا (یعنی حدیث تابعین کے ہاتھ سے مدون ہوئی)

حدیث نبوی محفوظ تو پہلے ہی سے تھی مگر زیادہ تر سینوں میں محفوظ تھی عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ ارادہ فرمایا کہ جس طرح علم و حکمت کا خزینہ سینہ میں محفوظ ہے اسی طرح سفینہ میں بھی محفوظ ہوجائے ممکن ہے کہ آئندہ چل کر حافظہ کمزور ہو جائے اور سینہ اس خزینہ کی حفاظت نہ کر سکے اس لیے مناسب ہے کہ اس وقت یہ خزینہ پوری طرح سینوں میں محفوظ ہے، اس کی نگرانی میں سفینہ میں محفوظ کر دیا جائے تاکہ اس کی محفوظیت میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

غرض یہ کہ دور تابعین میں تدوین حدیث کی بنیاد رکھی گئی اور اسی کے ساتھ تدوین فقہ کی بھی بنیاد رکھی گئی۔ اس دور کے علماء کے سامنے تین چیزیں تھیں۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سنت صحابہ۔ علماء تابعین نے ان تینوں چیزوں کو پیش نظر رکھ کر حدیث نبوی کو مدون کیا۔ جس طرح حدیث نبوی کتاب اللہ کی تفسیر ہے، اسی طرح اقوال صحابہ احادیث نبویہ کی شرح ہیں اس لیے علماء تابعین نے تدوین حدیث کے سلسلہ میں اقوال صحابہ کو بھی ساتھ ساتھ ذکر کیا[۱]۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ طبقۂ تابعین میں انتہائی تحقیق، تفتیش اور غایت درجہ تنقید کے بعد بھی ایک راوی بھی کاذب اور دروغ گو نہیں مل سکا[۲]۔

صدق اور کذب کی رفتار

صدق اور کذب ایک دوسرے کے قسیم اور مقابل ہیں۔ کذب کی رفتار سے صدق کی رفتار کا اندازہ ہوسکتا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ پچیس سال ماقبل پر نظر ڈالیے اور یہ اندازہ لگائیے کہ پچیس سال قبل دنیا میں کتنا کذب تھا اور کتنا صدق تھا اور اب کتنا ہے اگر فقط ایک ہی صدی کے صدق و کذب کی رفتار پر نظر ڈالیں تو زمین آسمان کا فرق نکلے گا۔ پس اگر آپ اسی رفتار سے گذشتہ زمانہ کی طرف چلنا شروع کریں اور تابعین کے

---

(۱) عہد تابعین میں موضوعات کے اعتبار سے جمع احادیث کا سلسلہ شروع ہوا کہ مکرمہ، مدینہ منورہ کے علاوہ، بصرہ، کوفہ، یمن، شام، خراسان، واسط، رے اور مصر میں موضوعات کی ترتیب کے مطابق مجموعات حدیث مرتب کیے گئے۔

(۲) ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۱: ص ۱۶۰

زمانہ تک پہنچ جائیں تو سوچو اور اندازہ لگاؤ کہ اس وقت کتنا صدق ہوگا اور کتنا کذب ہوگا۔ انشاء اللہ ثم انشاء اللہ تلاش سے بھی حدیث نبوی کا کوئی راوی بھی جھوٹا نہیں ملے گا اور حافظ ذہبی کے اس قول کا کہ طبقہ تابعین میں کوئی راوی کاذب نہیں ملا۔ آنکھوں سے مشاہدہ ہوجائے گا۔ حقیقت میں حافظ ذہبی کا یہ قول آب زر سے لکھنے کا قابل ہے۔ رحمۃ اللہ علی الحافظ الذھبی علی مر اللیالی والایام۔

سلسلہ روایت کی تیسری لڑی

تبع تابعین کا طبقہ ہے اس طبقہ میں آکر کذب نمودار ہوا اور لوگوں نے حدیثیں وضع کرنی شروع کیں اور چاہا کہ حق و باطل اور صدق و کذب کو خلط ملط کردیں حق جل شانہ کو اپنے نبی کی شریعت کی حفاظت مقصود تھی فوراً ہی ائمہ دین اور جبال علم و حفظ کو امت مرحومہ کی رشد و ہدایت کے لئے کھڑا کردیا۔

ومن قوم موسی امة یهدون بالحق وبه یعدلون[1].

(اور قوم موسیٰ میں ایک گروہ ہے کہ جو لوگوں کو حق کی راہ بتلاتا ہے اور اسی کے موافق فیصلہ کرتا ہے)۔

القاء ربانی اور تائید یزدانی سے یہ ائمہ دین اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے کھڑے ہوئے اور صادق اور کاذب کے کھوج لگانے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا اور علم اسماء الرجال اور علم جرح و تعدیل کی بنیاد رکھی۔

اس طبقہ کی نمایاں ہستیاں حسب ذیل ائمہ دین ہیں۔

---

(۱) ۷: الاعراف: ۱۵۹

امام مالک، اوزاعی[1]، لیث بن سعد[2]، سفیان ثوری[3]، سفیان بن عیینہ[4]، حماد بن زید[5]، حماد بن سلمہ[6]۔ یہ طبقہ ثالثہ کے رجال علم اور جبال حفظ ہیں جن کی امامت اور سیادت، علم اور حافظہ، ورع اور تقویٰ، فہم اور فراست، امانت اور دیانت، عدالت اور ثقاہت۔ امت میں مسلم ہے۔ اس طبقہ کی تمام تر روایتیں علماء تابعین سے ہیں جن کے پاس فقط احادیث نبویہ ہی کا ذخیرہ محفوظ نہ تھا بلکہ تمام صحابہ کرام کے ملفوظات مبارکہ، خلفاء راشدین کے احکام اور فیصلے بھی ان حضرات کے سینہ اور سفینہ میں محفوظ تھے۔ جس عاشقانہ اور والہانہ نظروں سے صحابہ نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا، اس کے بعد کے درجہ میں تابعین نے صحابہ کو دیکھا اور جو ان سے سنا اور دیکھا، وہ سب تبع تابعین کو سنادیا اور دکھلا دیا اور حسب ارشاد باری۔

واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتاب لتبیننہ للناس ولا تکتمونہ[7]۔

(اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم اس کتاب کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا اور کوئی بات اس کی نہ چھپانا)۔

---

(۱) اوزاعی: ابو عمرو عبد الرحمن بن عمرو الشامی: م ۱۵۷ھ

(۲) لیث بن سعد: م ۱۶۵ھ

(۳) سفیان ثوری: م ۱۶۱ھ

(۴) سفیان بن عیینہ: م ۱۹۸ھ

(۵) حماد بن زید: م ۱۷۹ھ

(۶) حماد بن سلمہ: م ۱۶۷ھ

(۷) سورۃ آل عمران: ۱۸۷

حضرات تابعین نے تبع تابعین کو تمام احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ سے آگاہ کردیا اور اس عرصہ میں جو جدید مسائل پیش آئے جن کا ظاہراً کوئی حکم کتاب و سنت میں منصوص نہ تھا اس میں علماء تابعین نے کتاب و سنت اور اقوال صحابہ کی روشنی میں اجتہاد اور استنباط سے کام لیا اور اپنے شاگردوں یعنی تبع تابعین کو اپنے استنباطات اور اجتہادات سے مطلع کردیا اور یہ بتلادیا کہ ہم نے ان مسائل میں یہ سمجھا ہے تم اسی روش پر چلنا۔

اب قابل غور امور یہ ہیں کہ تبع تابعین اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان میں صرف دو واسطے ہیں ایک صحابہ کا اور ایک تابعین کا اور یہ تمام سلسلہ روایت، سلسلہ عشاق ہے۔ اور یہ وہ سلسلہ عشق و عشاق ہے کہ جس میں نہ کذب کا امکان ہے اور نہ نسیان کا احتمال ہے۔ صحابہ کو دنیا سے اٹھے ہوئے ابھی پچاس سال بھی نہیں گذرے اور تمام علماء تابعین تدوین حدیث میں ہمہ تن مشغول ہیں پھر کون ہوش مند اس کو باور کرسکتا ہے کہ کلمات نبویہ اور سنن مصطفویہ کا تمام خزینہ اور گنجینہ یک لخت دنیا سے معدوم یا مشکوک اور موہوم ہوجائے اور صفحہ ہستی پر صحیح روایت کا کوئی راوی اور صحیح علم کا کوئی عالم باقی نہ رہے۔ افلاطون اور جالینوس کا علم تو محفوظ رہ جائے مگر فرستادہ یزدانی اور رسول ربانی اور طبیب روحانی کی تمام طب ایمانی پچاس برس کے اندر اندر دنیا سے ایسی گم ہو کہ اس کا نام و نشان باقی نہ رہے امام مالک، امام اوزاعی، لیث بن سعد کے بعد امام ابو یوسف، امام محمد، امام شافعی، یحییٰ بن سعید القطان، عبدالرزاق بن ہمام، مسعر بن کدام، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، احمد بن حنبل اور

عبدالرحمان بن مہدی[1] ان جیسے ائمہ حدیث کا دور آیا کہ جن سے صحاح ستہ کے مصنفین، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ[2] نے حدیث نبوی حاصل کی۔

امام مالک اور اوزاعی سے لے کر امام بخاری اور مسلم تک کا درمیانی زمانہ پچاس سال کا ہے کیا اتنے قلیل عرصے کے رجال علم اور رواۃ حدیث کے احوال کی تحقیق کوئی دشوار امر ہے کہ یہ پتہ ہی نہ چلے کہ کون صادق ہے اور کون کاذب، کون ثقہ ہے اور کون غیر ثقہ۔ کیا کوئی ادنیٰ عقل والا اس بات کو قبول کرسکتا ہے کہ امام مالک، امام شافعی، امام بخاری اور

---

(۱) امام ابویوسف یعقوب بن ابراھیم: م ۱۸۲ھ
امام محمد بن حسین بن فرقد الشیبانی: م ۱۸۹
امام شافعی، محمد بن ادریس: م ۲۰۴
یحییٰ بن سعید القطان: م ۱۴۵ھ / ۷۶۲ء
عبدالرزاق بن ہمام: م ۲۱۱ھ
مسعر بن کدام: م ۱۵۳ھ
یحییٰ بن معین: م ۲۳۳ھ / ۸۴۷ء
علی بن المدینی: م ۲۳۴ھ / ۸۴۸ء
احمد بن حنبل: م ۲۴۱ھ
عبدالرحمن بن مہدی: م ۱۹۸ھ
بخاری، محمد بن اسماعیل: م ۲۵۲ھ
مسلم بن الحجاج القشیری: م ۲۶۱ھ
ابوداؤد، سلیمان بن اشعث: م ۲۷۵
ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ: م ۲۷۹ھ
نسائی، ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب: م ۳۰۳ھ
ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید: م ۲۷۳ھ

امام مسلم (جن کا علم اور تقویٰ تاریخی حیثیت سے بھی تمام عالم میں طب افلاطون اور جالینوس سے زیادہ مسلم ہے) یہ حضرات علم حدیث پر بے شمار کتابیں لکھ ڈالیں اور ان کو اتنا بھی شعور نہ ہو کہ صادق اور کاذب میں امتیاز کرسکیں۔ معاذ اللہ یہ حضرات یا تو بد عقل اور بد فہم تھے صدق اور کذب میں فرق نہیں کرسکتے تھے یا سب کے سب دشمن اسلام تھے کہ دیدہ و دانستہ پوری امت کو گمراہی میں ڈال گئے۔

آخر بخاری اور مسلم کے پاس وہ کیا جادو تھا کہ جس نے مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کے تمام علماء پر ایسا سحر کیا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے درس کو سعادت سمجھنے لگے، بے وضوء اس کو ہاتھ لگانا بھی خلاف ادب سمجھنے لگے، طبقتہً بعد طبقتہ ان کتابوں کی روایت اور درس و تدریس کو شغل زندگی بنالیا، صدہا شروح اور حواشی ان کے لکھ ڈالے، ان رجال اور اسانید کی تحقیق اور تنقید میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اور ہزاراں ہزار کتابیں کلام، فقہ اور تصوف کی انہیں احادیث کی روشنی میں تصنیف کر ڈالیں۔ کیا یہ سب دیوانے اور بے عقل تھے کہ موضوعات اور مفتریات کے بے شمار انبار پر یہ تمام عمارتیں بنا ڈالیں کیا غزالی، رازی، تفتازانی اور جرجانی[1] نے کلام اور اصول فقہ کا جو سر بفلک قلعہ بنایا وہ سارا کا سارا ہوا ہی پر بنا گئے اور امت کے تمام علماء، صلحاء، حکماء، اذکیا، عباد، زہاد، امراء اور خلفاء سب بے عقل اور نادان تھے کہ بخاری اور مسلم اور صحاح ستہ

---

(۱) غزالی، ابوحامد محمد بن حامد: م ۵۰۵ھ

رازی، ابوعبداللہ محمد بن عمر، ۶۰۶ھ

تفتازانی، سعدالدین مسعود بن عمر: م ۷۹۲

کے چکر میں آ گئے اور یہ منکرین حدیث بڑے عاقل اور دانا ہیں کہ وہ اس چکر میں نہیں آئے۔ لقد استکبروا فی انفسهم وعتوا عتواً کبیراً [۱]۔ تیرہ صدی کے علماء اور عقلاء کو بے علم اور بے عقل بتلانا یہی بے عقلی کی دلیل ہے۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد　　میلش اندر طعنہ پاکاں برد [۲]

امام مالکؒ

امام دارالہجرت مالک بن انسؒ سنہ ۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۷۵ھ میں وفات پائی۔ امام مالکؒ کی امامت، جلالت قدر، عدالت اور وثاقت تمام امت میں مسلم ہے، یہ بھی مسلم ہے کہ امام مالکؒ تبع تابعی ہیں، علماء تابعین سے علم حاصل کیا اور انہیں سے روایت کی اور تابعین نے صحابہ سے روایت کی جن کی عدالت پر قرآن کریم شاہد ہے پس جبکہ امام مالکؒ کی عدالت اور ثقاہت میں شبہ نہیں، پھر تابعین کی عدالت میں شبہ نہیں۔ اور صحابہ کرام میں تو شبہ کی گنجائش نہیں۔ تو پھر امام مالکؒ کی روایت میں کہاں سے شک اور شبہ کی گنجائش نکل آئی۔ امام مالکؒ کا نقد اور روایت حدیث میں امام مالکؒ کی احتیاط محدثین میں مشہور اور ضرب المثل ہے۔ "کان لا یاخذ الا عن ثقة ولا یروی الا ماصح" (امام مالکؒ سوائے ثقہ کے کسی کی روایت نہیں لیتے تھے اور سوائے صحیح حدیث کے غیر صحیح کو روایت نہیں کرتے تھے) موطا امام مالکؒ کی احادیث اور

---

(۱)　۲۵: الفرقان: ۲۱

(۲)　جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ کسی کے عیوب کا پردہ فاش کردے تو اس کے دل میں نیک لوگوں پر طعنہ زنی کا خیال پیدا کر دیتا ہے۔

روایات کی اسانید اور طرق میں تین چار راوی سے زیادہ نہیں ہوتے اور اکثر وبیشتر ایسے ہوتے ہیں جن کی عدالت اور ثقاہت امت میں آفتاب اور ماہتاب سے زیادہ روشن ہیں۔

مثلاً مالک عن نافع عن ابن عمر عن النبی ﷺ الخ[1] امام مالکؒ نافع سے روایت کرتے ہیں جو عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ مگر علم اور تقویٰ میں اپنے زمانہ کے امام تھے۔ اپنے آقا عبداللہ بن عمرؓ یعنی حضرت عمرؓ کے صاحبزادے سے روایت کرتے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے نافع کو اہل مصر کی تعلیم و تربیت کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ یہ سند حضرات محدثین کے نزدیک اس درجہ بلند پایہ ہے کہ جس روایت کی سند مالک عن نافع عن ابن عمر ہو اصطلاح میں اس کو سلسلۃ الذہب کہتے ہیں۔ یعنی سونے کی زنجیر ہے موطاء کی اکثر روایتیں ثلاثی ہیں یعنی امام مالکؒ اور نبی کریم ﷺ کے درمیان میں تین واسطے ہوتے ہیں اور بہت حدیثیں ثنائی بھی ہیں یعنی امام مالکؒ اور نبی کریم ﷺ کے درمیان صرف دو واسطے ہیں اور ظاہر ہے کہ جس قدر واسطے کم ہوں گے اسی قدر استناد اور اعتبار کا پایہ بلند ہوگا اور علاوہ قلت وسائط کے موطاء کی حدیث کے پہلے راوی علماء تابعین ہوتے ہیں جن کی امامت، جلالت، عدالت اور ثقاہت آفتاب اور ماہتاب سے زیادہ روشن ہوتی ہے۔ اور دوسرے راوی کبار تابعین یا حضرات صحابہ ہوتے ہیں۔ جن کی عدالت اور ثقاہت نص قرآن سے ثابت ہے، صحابہ کرامؓ کی عدالت کا منکر ملحد اور زندیق ہے غرض یہ کہ موطاء کی ہر حدیث کی سند آفتاب اور ماہتاب کی طرح روشن اور درخشاں ہے۔

---

(۱) امام بخاری کے نزدیک یہ صحیح ترین سند ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ[1]

اسی بناء پر امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے:

ماعلی وجہ الارض من کتاب بعد کتاب اللہ اصح من موطاء مالک بن انس[2].

(روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد موطاء امام مالک سے زیادہ کوئی کتاب صحیح نہیں)۔

علماء کا یہ قول مشہور ہے "اول کتاب وضع فی الاسلام موطاء مالک"[3] حدیث کی سب سے پہلی کتاب اسلام میں موطاء امام مالکؒ ہے۔ جس کو زمانی اور رتبی دونوں قسم کی اولیت حاصل ہے اور ابوزرعہ رازی یہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص قسم کھا کر یہ کہے جو کچھ موطاء میں ہے وہ بلاشبہ صحیح ہے اور بعد ازاں یہ کہے کہ اگر میں اس قول میں جھوٹا ہوں تو میری بیوی پر طلاق تو اس کی زوجہ پر طلاق نہ پڑے گی غرض یہ کہ چودھویں صدی تک جس قدر بھی علماء اور اتقیاء گذرے ان کو موطاء امام مالک کے صحیح اور مستند ہونے میں کوئی شک اور شبہ نہیں مگر منکرین حدیث کے نزدیک وہ معتبر نہیں۔ مسلمان سوچ لیں کہ کونسی راہ بہتر ہے۔

امام بخاریؒ

۱۳ شوال سنہ ۱۹۴ھ میں بعد نماز جمعہ بخاریٰ میں پیدا ہوئے اور

---

(۱) اگر تو نہ (جو دن میں نہیں دیکھ سکتا) نہیں دیکھ سکتا تو اس میں سورج کی روشنی کا کیا قصور؟

(۲) سوطی، تنویر الحوالک، بیروت، دار الفکر، ج ۱: ص ۷

(۳) ایضاً

سنہ ۲۵۶ھ شب عید الفطر میں وفات پائی اور جن شیوخ اور اساتذہ سے علم حاصل کیا وہ امام مالکؒ کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد تھے جن کا علم، تقویٰ، ثقاہت اور امامت دنیا میں آج بھی آفتاب سے زیادہ روشن ہے، امام بخاریؒ کا خداداد فہم اور حافظہ، بے مثل ورع اور تقویٰ مسلمات تاریخ میں سے ہے۔ جس کی تفصیل کے لیے مستقل تصنیف درکار ہے اس مختصر رسالہ میں اس کی گنجائش نہیں۔

صحیح بخاری کی تالیف

یہ لاجواب کتاب ان چھ لاکھ حدیثوں کا انتخاب ہے جو امام بخاریؒ کو محفوظ تھیں جس شان سے صحیح بخاری کی تالیف عمل میں آئی وہ بھی ایک کرامت ہے وہ یہ کہ امام بخاریؒ جب کسی حدیث کے لکھنے کا ارادہ کرتے تو اول غسل کرکے دو رکعت نفل نماز ادا کرتے اور اس کے بعد حدیث کو لکھتے اس طرح سولہ سال کے عرصہ میں اس تالیف لطیف سے فراغت پائی۔ اور اسی طرح تراجم ابواب کو خاص طور پر مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک اور منبر نبوی ﷺ کے درمیان میں بیٹھ کر لکھا اور ہر ترجمۃ الباب کے لکھنے کے وقت دو رکعت نفل ادا کرتے۔

اس اخلاص اور حسن نیت کا یہ نتیجہ ہوا کہ جامع صحیح اتنی مقبول ہوئی کہ ان کی ہی زندگی میں نوے ہزار آدمیوں نے بلاواسطہ امام بخاریؒ سے یہ کتاب سنی اور پڑھی اور ان کی وفات کے بعد مشرق، مغرب، شمال، جنوب، مسجد حرام، مسجد نبوی ﷺ اور مسجد اقصیٰ میں اس کا درس جاری ہو گیا اور اب تک جاری ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا،

سینکڑوں حواشی اور شروح اس پر لکھے گئے اور انشاء اللہ لکھے جائیں گے، سلف سے لے کر خلف تک یہ معمول رہا کہ جب کوئی مصیبت اور پریشانی پیش آئی تو اس کے لیے علماء کرام نے مل کر صحیح بخاری کا ختم پڑھا۔ اللہ تعالیٰ نے ختم بخاری کی برکت سے یہ پریشانی دور فرمائی۔ علماء صالحین کا اجماع ہے کہ دشمنوں سے خوف کی حالت میں، مرض یا قحط سالی میں صحیح بخاری کی تلاوت تریاق کا حکم رکھتی ہے۔

کیا یہ تمام روئے زمین کے علماء کی متفقہ سازش تھی کہ بخاری کو اس درجہ آسمان پر پہنچایا کہ اس کی تلاوت اور اس کا درس و تدریس، اس کا حاشیہ اور شرح لکھنا عبادت اور سعادت سمجھنے لگے یا من جانب اللہ تلقی بالقبول تھی کہ بجلی کی طرح مشرق اور مغرب میں کوند گئی اور کوئی دل ایسا باقی نہ رہا کہ بخاری کی محبوبیت اور مقبولیت اس کے رگ و پے میں نہ سرایت کر گئی ہو لوانفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم انہ عزیز حکیم[۱]۔

(دلوں کو کسی بات پر متفق کر دینا یہ صرف خداوند کریم اور عزیز حکیم کی قدرت میں ہے بشر کی قدرت سے خارج ہے[۲]۔ خدا کی قسم مجھے تو اس قسم کی مقبولیت اور محبوبیت قرآن کریم کی مقبولیت اور محبوبیت کا ایک عکس اور پرتوہ معلوم ہوتی ہے۔ قرآن کریم کے بعد اس قسم کی مقبولیت دنیا میں سوائے صحیح بخاری کے کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔

---

(۱) ۸: الانفال: ۶۳

(۲) منکرین حدیث بخاری کی اس مقبولیت کو ایک بھیڑ چال سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لوگوں نے بخاری پر اندھا اعتقاد کر رکھا ہے، نہ معلوم بخاری پر لکھی جانی والی شروح اور ان میں بخاری کی تجزیاتی تحقیق ان کے علوم میں نہیں یا محض ضد کی وجہ سے یہ بات کہی گئی۔

صحیح مسلم

صحیح بخاری کے بعد یہ مقبولیت صحیح مسلم کو حاصل ہوئی اسی وجہ سے امت محمدیہ کا اجماع ہے کہ قرآن کریم کے بعد صحت اور وثاقت میں صحیح بخاری کا درجہ ہے اور اس کے بعد صحیح مسلم کا رتبہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں صحیحین کے لقب سے ملقب ہیں۔

امام مسلمؒ سنہ ۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۲۶۱ھ میں وفات پائی اور صحیح مسلم تصنیف فرمائی جو ان تین لاکھ حدیثوں کا انتخاب ہے جو ان کو محفوظ تھیں اور اس کا اہتمام اور التزام کیا کہ جو حدیث باجماع علماء صحیح اور معتبر تھی اسی کو اپنی صحیح میں درج فرمایا۔ علماء کا اتفاق ہے کہ امام مسلم صحیح اور سقیم کی معرفت میں اپنے تمام اہل عصر سے بڑھے ہوئے تھے بلکہ بعض امور میں بخاری پر فوقیت رکھتے تھے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے جن بے مثال شرائط صحت کا التزام فرمایا، وہ اصول حدیث کی کتابوں میں عموماً اور مقدمہ فتح الباری میں خصوصاً بالتفصیل مذکور ہیں[1]۔

خلاصۂ کلام

یہ کہ امام بخاری اور امام مسلمؒ نے امام مالکؒ کے ان شاگردوں سے علم حدیث حاصل کیا جن کی وثاقت، عدالت اور امامت دنیا میں آفتاب اور ماہتاب سے زیادہ روشن ہے اور جس تورع اور احتیاط کے ساتھ امام بخاری اور مسلم نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو تالیف کیا وہ بھی روز روشن کی طرح واضح ہے اور بخاری اور مسلم کے شائع ہوجانے کے بعد سند کا

---

(۱) ابن حجر، مقدمہ فتح الباری، ص ۹، ۱۰

سوال ہی ختم ہوگیا اس لیے کہ بخاری اور مسلم کے روایت کرنے والے ہر زمانہ میں سو دو سو نہیں بلکہ ایسے ہزاراں ہزار اور لاکھوں علماء ربانین ہوتے رہے ہیں کہ اہل زمانہ کو ان کی صداقت اور عدالت میں ذرہ برابر شبہ نہیں ہوا غرض یہ کہ بخاری اور مسلم کی سندیں حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اور تواتر بھی کوئی معمولی تواتر نہیں بلکہ ایسا بے مثال تواتر ہے کہ جس میں دنیا کی کوئی قوم ان کی شریک اور سہیم نہیں۔ کیا کوئی شخص اس تواتر کی نظیر یا عشر عشیر پیش کرسکتا ہے کہ جو صحیح بخاری اور مسلم کو حاصل ہے[1]؟

اب میں اس مختصر تحریر کو ختم کرتاہوں اور حق تعالیٰ سے امید کرتاہوں کہ یہ تحریر طالبان حق کے لیے کافی اور شافی ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ اور منکرین اور متردّدین سے درخواست کرتاہوں کہ اس تحریر کو بغور پڑھیں اور حق تعالیٰ شانہ کی طرف رجوع کریں۔ کہ اے اللہ ہم پر حق واضح فرما اور ہم کو اپنے رسول برحق اور اس کے عاشقین صادقین سے بدگمان مت بنا اور سبیل مومنین سے ہمارا قدم مت ہٹا۔ آمین یارب العالمین۔

ان ارید الا الاصلاح مااستطعت و ماتوفیقی الا باللّٰہ علیه توکلت والیه انیب. وآخر دعوانا ان الحمدللّٰه رب العالمین وصلی اللّٰه تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آله واصحابه وازواجه وذریاته اجمعین. وعلینا معهم یا ارحم الراحمین و یا اکرم الاکرمین و یا اجود الاجودین.

محمد ادریس کان اللّٰه له هو للّٰه آمین

۱۵/ رمضان المبارک سنه۱۳۷۱ھ

تضمین معرفت آگین

بہ

گر تو می خواہی مُسلماں زیستن
نیست ممکن جُز بہ قُرآں زیستن

اقبالؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن[۱]

۱۔ بشنواز قرآن چہ می گوید بتو — تو زغیر مصطفیٰ راہے مجو[۲]

کما قال تعالیٰ. "و ان هذا صراطی مستقیماً فاتبعوه و لا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیله ذلکم وصاکم به لعلکم تعقلون"[۳].

۲۔ نائب حق است و دلال وصال — رہنمائے بارگاہ ذوالجلال[۴]

۳۔ نیست راہے در جناب کبریا — جز بدامانِ رسولش اے کیا

۴۔ راہ مولیٰ از رسول اللہ جو — انچہ گوئی از نبی اللہ گو

۵۔ از نبی بشنو تو تفسیر قرآں — بر دل اوشد نزول این قرآں[۵]

"نزل به الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین"[۶].

---

(۱) اگر تو مسلمان کی زندگی چاہتا ہے تو قرآن کے بغیر یہ زندگی ممکن نہیں۔

(۲) قرآن کی زبان سے سن کہ وہ تجھے کیا کہتا ہے، تو راہ مصطفیٰ سے ہٹ کر کوئی راستہ تلاش نہ کر۔

(۳) ۶: الانعام: ۱۵۳

(۴) یہ قرآن حق کا نائب ہے اور وصال کی رہنمائی کرنے والا ہے، بارگاہ رب ذوالجلال کے لیے رہنما ہے۔

(۵) حق تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی راستہ معتبر نہیں ہے سوائے اس کے رسول کے دامن سے وابستہ رہ کر اے دہقان، اللہ کا راستہ رسول اللہ سے حاصل کرو، جو کچھ کہنا ہے، اللہ کے نبی سے کہو، نبی سے سن قرآن کی تفسیر کیونکہ ان کے دل پر ہی قرآن نازل ہوتا ہے

(۶) ۲۶: الشعراء: ۱۹۳

۶- ذات پاکش منبع نور ہدی

"قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین"(۲).

اس آیت میں نور سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے اور اسی کو زجاج نے اختیار کیا ہے (روح المعانی) نیز عطف سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نور۔ کتاب مبین کے علاوہ ہے۔

کرد قرآں نطق او وحی خدا(۱)

"وماینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی"(۳).

ہو کی ضمیر نطق رسول کی طرف راجع ہے جس کا ما قبل میں ذکر ہے قرآن کی طرف ضمیر راجع کرنا صحیح نہیں اس لیے کہ اول تو ما قبل میں قرآن کا ذکر نہیں۔ نیز ہوائے نفسانی کا احتمال عقلاً نطق رسول میں ممکن ہے۔ کلام اللہ میں یہ احتمال نہیں۔

۷- نطق او پاک و منزہ از ہوا ۔۔۔ شاہد او ہست والنجم ہویٰ(۴)

"وماینطق عن الھویٰ".

۸- علم او پاک و منزہ از ضلال ۔۔۔ فعل او محفوظ از غی و خبال(۵)

"ماضل صاحبکم و ماغوی". اس آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

---

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک نور ہدایت کا سرچشمہ ہے، قرآن نے اس کے کلام کو وحی خدا قرار دیا ہے۔

(۲) ۵: المائدہ: ۱۵

(۳) ۵۳: النجم: ۳، ۴

(۴) اس کی گویائی پاک اور منزہ ہے خواہش نفسانی سے اور اس کی شہادت سورہ والنجم اذا ھویٰ سے ملتی ہے۔

(۵) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم گمراہی سے منزہ اور پاک ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فعل گمراہی اور فساد سے پاک ہے خبال بمعنیٰ نقص و فساد۔

دو چیزوں کی نفی فرمائی۔ ایک ضلال کی اور ایک غوایت کی۔ علم کی غلطی کو ضلال کہتے ہیں، اور عمل کی غلطی اور خرابی کو غوایت کہتے ہیں۔ جب دونوں کی نفی ہو گئی معلوم ہوا کہ نبی کریم کا علم اور عمل دونوں غلطی سے پاک ہیں۔

۹۔ قلب او معصوم از کذب و خطا
چشم او مامون از زیغ و طغا[1]

"ماکذب الفواد مارئ"[2]
"مازاغ البصر و ماطغی"[3]

اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قلب مبارک کا کذب اور خطا سے پاک ہونا بیان فرمایا۔

اس آیت میں حضور کی بصر مبارک کا زیغ اور طغیان یعنی کجی اور غلطی سے پاک ہونا بیان فرمایا۔

غرض یہ کہ اس آیت میں پانچ چیزیں بیان فرمائیں نطق رسول کا ہوائے نفسانی سے پاک ہونا، علم کا معصوم ہونا، عمل کا معصوم ہونا، قلب اور ادراک کا معصوم ہونا، چشم، سر اور اس کے ابصار کا معصوم ہونا۔ پس جس ذات کی یہ پانچ چیزیں خطا اور غلطی سے معصوم اور مامون ہوں۔ اس کے کلام کی حجیت میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟

۱۰۔ طاعت او طاعت حق بیگماں
بیعت او بیعت رب جہاں[4]

"من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ"[5].

"ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللّٰہ یداللّٰہ فوق ایدیھم"[6].

---

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قلب جھوٹ اور خطاء سے محفوظ ہے، آپ کی آنکھ کجروی اور گمراہی سے مامون ہے

(۲) ۵۳: النجم: ۱۱ (۳) ایضاً: ۱۷ (۴) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت بلاشبہ پروردگار عالم کی اطاعت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بیعت بلاشبہ رب دوجہاں کی بیعت ہے

(۵) ۴: النساء: ۸۰ (۶) ۴۸: الفتح: ۱۰

۱۱- اوز سرتا پادلیل و حجت است
که وجودش بہر عالم رحمتست[۱]

"یاایھاالناس قدجاءکم برھان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبینا"[۲]۔

"ومآارسلنک الارحمة للعالمین"[۳]۔

ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس آیت میں برہان سے نبی اکرم ﷺ کی ذات بابرکات مراد ہے اور نور مبین سے قرآن کریم مراد ہے اور عطف کا مقتضیٰ بھی مغایرت ہے۔

۱۲- فی رسول اللہ مارا اسوہ
سنت او ہست مارا قدوہ[۴]

"لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوة حسنة لمن کان یرجواللّٰہ والیوم الاخر وذکراللّٰہ کثیراً"[۵]۔

۱۳- النبی اولیٰ بنا من نفسنا
مثل نورالشمس فوق ارضنا[۶]

"النبی اولی بالمؤمنین من انفسھم وازواجه امھاتھم"[۷]۔

اور ایک قراءت میں ہے "وھواب لھم"۔

یعنی جس زمین قلب پر آفتاب نبوت کا عکس اور پرتو پڑتا ہے۔ وہ زمین۔ نور ایمان اور روشنی ہدایت سے منور ہوجاتی ہے۔

---

(۱) وہ سر سے پیر تک سراپا دلیل و حجت ہیں کیونکہ آپ ﷺ کا وجود عالم کے لیے رحمت ہے۔

(۲) ۴: النساء: ۱۷۴ (۳) ۲۱: الانبیاء: ۱۰۷

(۴) رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے آپ ﷺ کی سنت ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ (۵) ۳۳: الاحزاب: ۲۱

(۶) نبی کا تعلق ہماری ذات کے ساتھ، ہمارے اپنے نفس سے زیادہ ہے، ہماری زمین پر سورج کی روشنی کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ (۷) ۳۳: الاحزاب: ۶

۱۴- مارمیت اذ رمیت ہم بخوان　　تاحجابت رفع گردد ازمیاں[1]

۱۵- گفتۂ او گفتۂ اللہ داں　　چوں درخت موسیٰ عمران بداں

۱۶- آنچہ آوازیکہ آمد از درخت　　از خدا بودہ نہ بودہ از درخت[2]

حقیقت نبوت و مقصد بعثت

۱۷- چوں خدائے پاک ناید درعیاں　　اونہاں اندر نہاں اندر نہاں

۱۸- نائبانش ساختہ پیغمبراں　　تابیبند چشم خلق ایں اختراں

۱۹- ہر نبی مرآۃ نور ذوالجلال　　بہر جان و دل طبیب بیمثال

۲۰- ظل رحمٰں ہر یکے من غیر ریب　　بہر عالم آمدہ باران غیب

۲۱- عاقلاں گفتند ایں آب حیات　　ابلہاں گفتند سامان ممات

۲۲- ابلہے گفتہ کہ ایں دیوانۂ　　عاقلے شد شمع ایں پروانۂ[3]

حقیقت انکار حدیث

۲۳- منکر قول نبی ناداں فضول　　در حقیقت عقل خود داند رسول

---

(۱)　ومارمیت اذرمیت ۸: الانفال: ۱۷، کو بھی پڑھ کر دیکھ تاکہ تیرے اور اللہ کے درمیان سے پردے ہٹ جائیں۔

(۲)　ان کے کہنے کو اللہ کا کہنا ہی شمار کر موسیٰ بن عمران کے درخت کی طرح (یعنی وہ آواز اللہ کی آواز تھی نہ کہ درخت کی) وہ آواز درخت سے آرہی تھی وہ دراصل اللہ کی آواز تھی۔

(۳)　چونکہ اللہ تعالیٰ ظاہر نہیں ہوتے اس لیے کہ وہ پوشیدہ، در پوشیدہ، در پوشیدہ ہیں۔ اس کے نائبین کو پیغمبر قرار دیا گیا تاکہ مخلوق کی آنکھ ان ستاروں کو دیکھ سکے۔ ہر نبی اللہ ذوالجلال کا آئینہ ہے اور ہر جان و دل کے لیے بے مثال طبیب ہے۔ ہر ایک رحمٰن کا سایہ ہے بلاشبہ، عالم کے لیے غیب کی بارش بن کر آئے ہیں۔ عقلمند کہتے ہیں کہ یہ (نبی) آب حیات ہیں اور بیوقوف کہتے ہیں کہ ہماری موت کا سامان ہیں۔ بیوقوف نے کہا کہ یہ تو دیوانے ہیں اور عقلمند آدمی اس شمع کا پروانہ ہو گیا۔

۲۴- ہر یکے گوید کہ من پیغمبرم — وز رسول مصطفیٰ دانا ترم

زیرا کہ اگر رسولِ حق را از خود دانا تر دانستے اتباع او لازم گرفتے[۱]

۲۵- بلکہ بگرفتہ ہوائے خود الہٰ — ایں دلیل گمرہی بے اشتباہ[۲]

"افرأيت من اتخذ الهه هواه"[۳].

۲۶- بردلِ او حق نہادہ ختمہا — پردہا افراختہ از خشمہا

۲۷- دعوئے قرآن و انکار نبی — نیست ممکن جز بہ گمراہ و غبی

۲۸- ای عدو اللہ چہ عوعومی کنی — درحدیث مصطفیٰ غو غو کنی

۲۹- دامن خیر الوریٰ بگذاشتی — بولہب را پیشوایت ساختی[۴]

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

۳۰- باز جو شرح حدیث مصطفیٰ — از نجوم رشد یارانِ صفا[۵]

اشارة بحديث. اصحابي كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم اخرجه ابن عبدالبر عن ابن عمرؓ و عن جابر[۶]

---

(۱) نبی کریم ﷺ کے قول کا منکر نہایت بے وقوف ہے، اور حقیقت میں وہ اپنی عقل کو نبی سمجھتا ہے۔ منکرین حدیث میں سے ہر ایک گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں ہی پیغمبر ہوں اور نبی کریم ﷺ سے زیادہ عقلمند ہوں کیونکہ اگر نبی کریم ﷺ کو اپنے سے زیادہ دانا سمجھتے تو ان کا اتباع لازماً اختیار کرتے۔

(۲) بلکہ اس نے اپنی خواہشات کو معبود بنا رکھا ہے اور یہ بات اس کی گمراہی کی کھلی دلیل ہے۔

(۳) ۲۵: الفرقان: ۴۳ (۴) اس کے دل پر اللہ تعالیٰ نے مہریں لگادی ہیں اور ناراضی اور خفگی کی وجہ سے بے شمار پردے ڈال دیے ہیں۔ قرآن پر عمل کا دعویٰ نبی کے اتباع کے بغیر کودن یا گمراہ کے علاوہ کسی سے ممکن نہیں۔ اے اللہ کے دشمن یہ کیا بکواس کر رہے ہو، حضور ﷺ کی حدیث میں گستاخانہ بات کیوں کرتے ہو۔ نبی خیر الوریٰ کا دامن تو نے چھوڑ دیا ہے اور ابولہب کو اپنا پیشوا بنالیا ہے۔

(۵) پھر تلاش کر حدیث مصطفیٰ کی شرح، نبی کے یاران باصفا سے۔

(۶) ابن عبدالبر، جامع بیان العلم: ص ۱۵۲

۳۱- از ابوبکر و عمر عثماں علی — گر تو داری عقل و از اہل دلی

۳۲- ہست عقل مصطفیٰ چوں آفتاب — عقل یارانش بداں جوں ماہتاب
وزد حکما نور قمر مستفاد از نور شمس است[1]

۳۳- چشم بینا عاشق شمس النہار — چشم خفاش است ظلمت دوستدار[2]

شیخ جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں۔

والعجب من ھولاء حیث ضللوا الصحابة وردوا الاحادیث لانھا من روایاتھم و ذلک یلزمھم فی القرآن ایضا لان الصحابة الذین رووالناالحدیث ھم الذین رووالنا القرآن فان قبلوہ لزمھم قبول الاحادیث اذ الناقل واحد[3].

ان لوگوں سے تعجب ہے کہ صحابہ کو گمراہ بتاتے ہیں۔ اور احادیث کو اس لیے رد کرتے ہیں کہ وہ صحابہ کی روایت کردہ ہیں۔ ان لوگوں پر یہ اشکال ہوگا کہ ان کو چاہیے کہ قرآن کریم کو بھی قبول نہ کریں اس لیے کہ جن صحابہ نے حدیث کو نقل کیا ہے وہی قرآن کے ناقل اور راوی ہیں۔ پس جب کہ ناقل قرآن وحدیث کا ایک ہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ اسی ناقل کی ایک نقل یعنی قرآن تو معتبر اور مقبول ہو اور اسی ناقل کی دوسری نقل

---

(۱) ابوبکرو عمر، عثمان و علی سے حدیث حاصل کر، اگر تو عقل رکھتا ہے اور اھل دل میں سے ہے۔ نبی کریم ﷺ کی عقل مبارک آفتاب کی طرح ہے اور آپ ﷺ کے صحابہ کی عقل وفہم ماہتاب کی طرح ہے۔ حکماء کے نزدیک چاند سورج سے ہی روشنی حاصل کرتا ہے یعنی حضرات صحابہ نے حضور سے ہی نور ہدایت حاصل کیا ہے۔

(۲) دیکھنے والی آنکھ سورج کی روشنی کی عاشق ہوتی ہے اور چمگادڑ کی آنکھ تاریکی کو دوست رکھتی ہے

(۳) سیوطی، جلال الدین، مفتاح الجنة فی الاحتجاج بالسنہ ص ۵۳

یعنی حدیث معتبر نہ ہو پس اگر قرآن کو قبول کریں تو حدیث کو بھی قبول کرنا پڑے گا اس لیے کہ دونوں جگہ ناقل اور راوی ایک ہی ہے۔

ائمہ اجتہاد

۳۴۔ مالک و نعمان زہرہ مشتری　　نکتہ دانایانِ دین سروری

۳۵۔ تا ثریا بود پرواز عقول　　عقل کلی بود در علم رسول

۳۶۔ بوحنیفہ بد امام باصفا　　آں سراج امت خیر الوریٰ

۳۷۔ جملہ اعیان فقہ از آل او　　عقل اوّل بدز شاگردان او[1]

ائمہ حدیث

۳۸۔ حافظ علم نبی ای احوذی　　ایں بخاری راببیں ایں ترمذی

۳۹۔ کس ندیدہ زیر چرخ چنبری　　مثل اوشاں حافظ علم نبی

۴۰۔ مجلس تحدیث جویا صوت شاں　　ایں زمین و آسماں گریان شاں

۴۱۔ ایں چنیں حفظ و تفقہ کہ بدید　　ہیچ گوشے مثلِ ایشاں کے شنید[2]

---

(۱) امام مالک اور امام ابوحنیفہ زہرہ اور مشتری کی طرح ہیں، دین سروری کے نکتہ دان ستارے ہیں۔ آسمان کی بلندیوں تک عقل کی پرواز ہو سکتی ہے، عقل کلی علم رسول ﷺ میں ہی پوشیدہ ہے۔ امام ابوحنیفہ امام باصفا ہیں، نبی کریم ﷺ کی امت کے روشن چراغ تھے۔ علم فقہ کے اکابر ان کی اولاد ہیں اور عقل اول بھی امام صاحب کے شاگردوں میں سے ہے۔

(۲) امام احوذی (شارح ترمذی) حافظ علم حدیث ہیں، امام بخاری کو دیکھو، اور امام ترمذی کو دیکھو۔ کسی نے بھی اس مدور آسمان کے نیچے ان جیسا نبی کے علوم کا حافظ نہیں دیکھا۔ ان کی آواز ہر وقت مجلس حدیث کی تلاش میں ہے یہ زمین و آسمان ان کو یاد کر کر کے رونے والے ہیں۔ اس طرح کا حافظ اور تفقہ دنیا میں کس نے دیکھا ہے۔ کون [illegible] ن کی طرح کا کس نے سنا ہے۔

اتباعِ سلف

۴۲۔ گر تومی خواہی مسلماں زیستن
ہست لازم مثل ایشاں زیستن[1]

۴۳۔ ہر کہ غیر راہ ایں پاکاں برفت　　نام اسلام است معنی کفر ہست

۴۴۔ بر ہوا تاویل قرآں می کند　　خود گم است و جملہ را گمرہ کند[2]

اجماعِ امت

۴۵۔ ہر کہ جوید غیر راہ مومنین　　نزد قرآں نیست او از مسلمین[3]

تلمیح است بہ ارشاد باری "و من یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ و یتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولّی و نصله جهنم وساءت مصیراً"[4]. و تفصیل استدلال بایں آیت بر حجیت اجماع در کتب اصول فقہ مذکور و مسطور است۔

۴۶۔ ذات پاکش منبع علم و حکم　　زیں سبب شد امتثل خیر الامم

۴۷۔ اتفاقش برجہاں شد حجتے　　از نبی شد وارثے در عصمتے[5]

اشارہ است بحدیث لا تجتمع امتی علی الضلال وهو حدیث صحیح

(۱) اگر تو مسلمان کی زندگی چاہتا ہے، تو ان کی طرح زندگی گذارنا ضروری ہے۔

(۲) جو شخص ان پاکیزہ لوگوں کے راستہ سے ہٹ کر چلے گا، نام اسلام کا ہوگا، حقیقت میں کفر ہوگا۔ خواہشات نفسانی کے مطابق قرآن کی تفسیر کرتا ہے خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔

(۳) جو شخص مسلمانوں کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرے گا، قرآن کے نزدیک وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔　(۴) ۴:النساء:۱۱۵

(۵) آپ ﷺ کی ذات علم و حکمت کا سرچشمہ ہے اسی وجہ سے خیر الامم کا اتباع ضروری ہوا۔ اس امت کا اتفاق دنیا پر حجت ہوگیا، عصمت میں یہ لوگ نبی کے وارث ہوگئے۔

مشهور لا شک فی صحتة[۱]

فہم قرآں

۴۸۔ ہست قرآں بے شبہ کامل ولیک　　بہر فہم او باید عقل نیک

۴۹۔ دعوئے عقلت فہمت مضطرب　　تو نداری یاد میزاں منشعب[۲]

اتباع نبی اکرم ﷺ

۵۰۔ گر تومی خواہی طریق زیستن
بشنواز قرآں طریق زیستن[۳]

۵۱۔ آں طریق است اتباع مصطفیٰ　　با ہزاراں صدق و اخلاص و وفا[۴]

"قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم"[۵]. "قل اطیعوا اللہ والرسول فان اللہ لایحب الکافرین"[۶].

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جو اللہ کی محبت کا دعویٰ کرے اور نبی کریم ﷺ کے اتباع اور اطاعت کو لازم نہ سمجھے وہ کافر ہے اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

---

(۱)　ابن ماجہ، سنن (۳۹۵۰) ج ۲: ص ۱۳۰۳۔ باب السواد الاعظم (۸) کتاب الفتن
شرح التحریر، ج ۳: ص ۸۵

(۲)　قرآن کریم بلاشبہ کامل ہے لیکن، اس کو سمجھنے کے لیے عقل نیک کی بھی ضرورت ہے۔ تو عقل کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور تیری سمجھ پریشان ہے، کبھی کچھ کبھی کچھ تجھے تو میزان منشعب (علم صرف کی ابتدائی کتاب) بھی یاد نہیں ہے۔

(۳)　اگر تو زندگی کا طریقہ چاہتا ہے تو قرآن کریم سے زندگی کا طریقہ سیکھ لے۔

(۴)　وہ طریقہ نبی کریم ﷺ کی اتباع ہے مگر ہزاروں صدق، اخلاص اور وفا کے ساتھ۔

(۵)　۳: آل عمران: ۳۱

(۶)　ایضاً: ۳۲

۵۲- اولا قرآن خواں بازش حدیث — فہم قرآں نیست ممکن جز حدیث

۵۳- بہر قول مصطفیٰ تو گوش باش — بہر فہم معنیش تو ہوش باش

۵۴- بہر طاعت عاشق ومدہوش باش — بہر دیدہ طوطیان کن خاک پاش

۵۵- در شعاع نورشرعش لاشو — در ہوایش از ہمہ دستت بشو

۵۶- گر نبودے ذات پاک مجتبےٰ — باز اصحابش نجوم ابتدا

۵۷- کے رسیدے ایں کلام حق بما — رحمتہ اللہ علیہم دائما

۵۸- از زبان مصطفیٰ خیرانام — آمدہ از حق بمایاں ایں پیام

۵۹- صد ہزاراں رحمت ولکھہا سلام — بر رسول سرور عالی مقام[۱]

ایمان بالرسول ﷺ

۶۰- گر تومی خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ ایماں زیستن[۲]

"ومن لم یؤمن باللہ ورسولہ فانا اعتدنا للکافرین سعیراً"[۳].

"والذین آمنوا بما نزل علی محمد وھو الحق من ربھم کفر عنھم سیاتھم واصلح بالھم"[۴].

---

(۱) پہلے قرآن پڑھ، اس کے بعد حدیث، کیونکہ قرآن کا سمجھنا حدیث کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ نبی کریم کے اقوال کے لیے تو سراپا کان بن جا اور ان کے معنیٰ کو سمجھنے کے لیے سراپا ہوش بن جا۔ نبی کریم ﷺ کی عاشقانہ اور دیوانہ وار اطاعت کے لیے تیار ہوجا اور ہر بہتان تراش آنکھ پر مٹی ڈال دے۔ ان کی شریعت کے نور کی شعاعوں پر تو فنا ہوجا، اوران کی خواہشات میں سب سے اپنے ہاتھ دھولے (سب سے لاتعلق ہوجا) اگر رسول اللہ ﷺ کی ذات پاک نہ ہوتی پھر ان کے صحابہ ہدایت کے ستارے نہ ہوتے۔ اللہ کا یہ کلام ہم تک کیسے پہنچتا۔ اللہ ان پر ہمیشہ اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ پیام ہم تک آیا ہے۔ سو ہزار رحمتیں اور لاکھوں سلام ہوں نبی عالی مقام پر (ﷺ)

(۲) اگر تو مسلمان کی زندگی چاہتا ہے، تو ایمان کے بغیر یہ زندگی ممکن نہیں ہے

(۳) ۴۸:الفتح: ۱۳ (۴) ۴۷: محمد: ۲

۶۱۔ نیست ایماں نزد ارباب عقول | جز بہ تصدیق خداؤ ہم رسول[۱]

"ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نومن ببعض و نکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلاً اولئک ھم الکافرون حقا واعتدنا للکافرین عذاباً مھیناً"[۲]۔

یعنی جو لوگ خدا اور رسول میں تفریق کریں کہ اللہ کو تو مانیں اور رسول کو نہ مانیں ایسے لوگ، اصلی اور پکے کافر ہیں۔ بغیر نبی کے مانے اللہ کا ماننا معتبر نہیں۔ رسول کی تکذیب اللہ کی تکذیب ہے۔

"قد نعلم انہ لیحزنک الذی یقولون فانھم لا یکذبونک ولکن الظالمین بایات اللہ یجحدون"[۳]۔

۶۲۔ چیست ایماں بر نبی مفتوں شدن | برجمال شرع او مجنوں شدن

۶۳۔ چشم بکشا گوش کن سوئے قرآں | در وعید منکر پیغمبراں

۶۴۔ قوم نوح و قوم لوط و قوم ہود | قوم عاد و قوم فرعون و ثمود

۶۵۔ ہر یکے پیغمبراں تکذیب کرد | حق تعالیٰ جملہ را نابود کرد[۴]

ان کل الاکذب الرسل فحق عقاب[۵]

۶۶۔ خسرو پرویز نامہ چاک کرد | پارہ پارہ گشت آں ناپاک مرد[۶]

---

(۱) اہل عقل کے نزدیک ایمان کی حقیقت سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی تصدیق کی جائے۔ (۲) ۴: النساء: ۱۵۰ (۳) ۶: الانعام: ۳۳

(۴) ایمان کیا ہے؟، نبی پر فریفتہ ہوجانا، ان کی شریعت کے حسن و جمال پر دیوانہ ہوجانا۔ آنکھیں کھول اور قرآن کی طرف کان لگا اور پیغمبروں کے منکرین کی سزاؤں میں غور کر۔ قوم نوح، قوم لوط، قوم ہود، قوم عاد، قوم فرعون اور قوم ثمود۔ ان سب نے انبیاء کو جھٹلایا، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو نیست و نابود کردیا۔ (۵) ۳۸: ص: ۱۴

(۶) خسرو پرویز نے آپ کا نامہ مبارک چاک کردیا تھا، اس ناپاک انسان کی سلطنت پارہ پارہ ہوگئی۔

۶۷۔ گر تومی خواہی مسلماں زیستن
نیست ایں راہے مسلماں زیستن[1]

رؤیا الانبیاء وحی (امام بخاری)

حضرات انبیاء کرام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے

قال یابنی انی اریٰ فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تری[2]

امام بخاری باب التخفیف فی الوضوء میں فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ اگر نبی کا خواب وحی نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا محض خواب کی بناء پر بیٹے کو ذبح کرنا جائز نہ ہوتا[3]۔ نیز جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے اپنا خواب ذکر کیا تو اسمعیل علیہ السلام نے یہ فرمایا "یا ابت افعل ماتومر"[4]. اے باپ بذریعہ خواب کے جس چیز کا آپ کو حکم دیا جارہا ہے اس کو کر گذرئیے "ستجدنی انشاء اللہ من الصابرین"[5] حضرت اسماعیل علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب کو تومر سے تعبیر کیا۔ معلوم ہوا کہ نبی کا خواب امر خداوندی ہے۔ مومن کا کام ہے کہ نبی کے خواب پر اپنی جان کو بے دریغ قربان کردے۔ اور اسی وجہ سے کہ نبی کا خواب بمنزلہ بیداری کے ہے، امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ نبی کا خواب ناقض وضو نہیں۔

---

(۱) اگر تو مسلمان کی زندگی چاہتا ہے تو انکار حدیث کا یہ راستہ، مسلمان کا راستہ نہیں ہے۔

(۲) ۳۷: الصافات: ۱۰۲۔

(۳) بخاری، الجامع الصحیح، (۱۳۸) ج ۱: ص ۶۴- باب التخفیف فی الوضوء (۵) کتاب الوضوء

(۴) ۳۷: الصافات: ۱۰۲

(۵) حوالہ مذکور

نوم النبی عند الامام الاعظم　　لاینقض الوضوء حتما فاعلم

(نبی کی نیند سے امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک وضو یقیناً نہیں ٹوٹتی)

صحیح بخاری میں انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تنام عینه ولاینام قلبه وکذلک الانبیاء تنام اعینهم ولا ینام قلوبهم"[۱]. یعنی آپ کی آنکھ تو سوتی ہے مگر دل نہیں سوتا۔ اسی طرح تمام انبیاء کرام کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتے۔

۶۸۔ بشنو از قرآں ز خواب انبیاء　　ماہیان بحر علم کبریا[۲]

۶۹۔ خواب ہر کس حسب عقل او بود　　خواب زن چوں خواب مرداں کے بود

۷۰۔ اے اخی خواب نبی ہم وحی ہست　　خواب پیغمبر ہمہ بیداری است

۷۱۔ خواب پیغمبر چو صبح صادقست　　وحی بیداری چو روز روشن است[۳]

۷۲۔ گر تو می خواہی مسلماں زیستن
ہمچو اسمعیل باید زیستن[۴]

۷۳۔ بہر قرباں سر بنہ بر خواب او　　ایں حیات جاودانست اے عمو[۵]

---

(۱) بخاری، الجامع الصحیح، (۶۸۵۲) ج۶: ص۲۶۵۶ باب الاقتداء بسنن رسول اللہ(۲)۔ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ۔

(۲) قرآن کریم سے انبیاء کے خواب کا تذکرہ سنو جو اللہ کے علم کے سمندر کی مچھلیاں ہیں۔

(۳) ہر آدمی کا خواب اس کی عقل کے مطابق ہوتا ہے، عورت کا خواب مرد کے خواب کے برابر کیسے ہو سکتا ہے۔ اے بھائی نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے پیغمبر کا خواب بیداری ہی ہوتا ہے۔ پیغمبر کا خواب صبح صادق کی طرح ہے اور بیداری کی وحی روز روشن کی طرح واضح ہے۔

(۴) اگر تو مسلمان زندگی چاہتا ہے تو اسمعیل علیہ السلام کی طرح جینا چاہیے۔

(۵) باپ کے خواب پر قربانی کے لیے سر زمین پر رکھ دیا یہ حقیقت میں ہمیشہ کی زندگی ہے اے چچا۔

۷۴- این سخن را نیست ہرگز اختتام
ختم کن بر عرض حاجت این کلام[۱]

۷۵- اے خدائے پاک رب دو جہاں لطف فرما برتر از وہم وگماں

۷۶- اے خدائے پاک رب ذوالجلال بے حدی تو در عطاء و در نوال

۷۷- تو غنی مطلقی اے ذوالجلال من فقیر مطلقم بے قیل و قال

۷۸- تو کریمی من گدائے مطلقم تو عزیزی من ذلیل مطلقم

۷۹- صد ہزاراں فضلہاوؔ لطفہا برسرم ریزاں چو آب ازمشکہا

۸۰- اے خدائے پاک رب ذوالمنن دست گیری کن بایں دور فتن

۸۱- از تومی خواہیم ما قرب و رضا باز ظل مصطفیٰ روز جزا

۸۲- لطف فرما اے خدا روز عتید رحمتے کن در جزائے این نشید

۸۳- این نشید واین قصیدم بہر تو بہر ناموس رسول پاک تو

۸۴- این ہمہ القاء تو کلکم چونئے اے خدایک جرعہ در کامم زمے

۸۵- روسیاہم من زسرتاپا پلید لیک لطفت می دمد درمن امید

---

(۱) اس کلام کے لیے کسی مرحلہ پر بھی اختتام نہیں ہے اس لیے اس کلام کو اپنی حاجت عرض کرنے کے ساتھ ختم کردے۔

۸۶- اے خدا بر سر بزن آب طہور　　این سیاہی را مبدل کن بہ نور[۱]

۸۷- ھکذا انعم الیٰ دار السلام
بالنبی المصطفیٰ خیر الانام[۲]

---

(۱) اے دوجہاں کے پالنے والے خدا، وہم وگمان سے بڑھ کر مہربانی فرما- اے خدائے پاک، اے رب ذوالجلال تیری ذات اپنی عطاء اور بخشش میں بے نہایت ہے- تو غنی مطلق ہے اے ذوالجلال، اور میں بلاچون وچرا فقیر مطلق ہوں- تو کریم ہے اور میں گدائے بے نوا- تو قادر و غالب ہے اور میں عاجز محض ہوں- لاکھوں فضل اور لاکھوں مہربانیاں میرے سر پر اس طرح برسیں جیسے مشکوں پانی برستا ہے- اے خدا سراپا احسان کرنے والے پروردگار اس پر فتن دور میں دستگیری فرما- تجھ سے تیرا قرب اور تیری رضا چاہتے ہیں- اور روز جزاء نبی کریم ﷺ کا سایہ عاطفت چاہتے ہیں- اے خدا روز جزاء مہربانی فرما، رحمت نازل فرما ان اشعار کی جزاء میں- میرے یہ اشعار اور میرا یہ قصیدہ تیری ذات کے لیے ہے اور تیرے رسول پاک کی عزت وناموس کی خاطر ہے- یہ سب کچھ تیرا القاء ہے، میرا قلم تو بانسری کی طرح ہے- اے خدا ایک گھونٹ میرے مقصد میں اپنی شراب معرفت کا عطاء فرما- میں روسیاہ ہوں اور سر سے پیر تک سراپا نجاست ہوں، لیکن تیری مہربانی میرے اندر امید کی روح پھونک رہی ہے- اے خدا میرے سر پر پاک کرنے والا رحمت کا پانی ڈال دے، اس سیاہی کو نور سے تبدیل فرمادے-

(۲) اسی طرح ہمیں دار السلام (جنت) کی طرف چلا، نبی مصطفیٰ خیر الانام کے ہمراہ (یہ شعر عارف رومی قدس سرہ السامی کا ہے)

اشاریہ

فہرست آیات :

فہرست احادیث :

ماخذ و مصادر :

آیاتِ قرآنیہ

احادیث نبویہ

ماخذ و مصادر

۱. القرآن الکریم

۲. ابن بشکوال، خلف بن عبدالملک، کتاب الصله

۳. ابن حجر، احمد بن علی العسقلانی، فتح الباری شرح صیح البخاری بیروت، دارالمعرفة، (س ن)

۴. ابن حزم، الاحکام

۵. ابن سعد، محمد، الطبقات الکبری بیروت، داراصادر، (س ن)

۶. ابن عبدالبر، جامع بیان العلم و ففضله، مصر، اداره الطباعة المنیریة، (س ن)

۷. ابن قیم الجوزی، محمد بن ابی بکر، اعلام الموقعین، مصر، مطبع نیل (س ن)

۸. ابن کثیر، اسمٰعیل بن عمر، البدایة والنهایة، لاہور، المکتبة القدوسیة، ۱۹۸۴

۹. ایضاً، تفسیر القرآن العظیم، بیروت، دارالمعرفه، ۱۹۶۹

۱۰. ابن ماجه، ابو عبدالله محمد بن یزیدالقزوینی؛ کتاب السنن، بیروت، داراحیاء، ترقیم فواد عبدالباقی

۱۱. ابن هشام، عبدالملک، السیرة النبویة، بیروت، داراحیاء، تحقیق، مصطفیٰ السقا

۱۲. ابو داؤد، سلمان بن اشعث السجستانی، کتاب السنن، بیروت، دارالفکر، ترقیم محمد محی الدین عبدالحمید

۱۳. بخاری، محمد بن اسمٰعیل، الجامع الصیح، دمشق، دار ابی کثیر، ترقیم، مصطفیٰ دیب البغا

۱۴. بیہقی، ابوبکر محمد بن حسین، دلائل النبوۃ، بیروت، دارالکتب العلمیۃ، (س ن)

۱۵. پرویز، غلام احمد، مفہوم القرآن، لاہور، ادارۂ طلوع اسلام، ۱۹۶۱

۱۶. ترمذی، محمد بن عیسیٰ، کتاب الجامع، ملتان، نشرالسنۃ

۱۷. حاکم، ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ، المستدرک علی الصحین فی الحدیث، ریاض، مکتبۃ العارف، (س ن)

۱۸. دارمی، ابو محمد عبداللہ، سنن الدارمی، ملتان، نشرالسنۃ،

۱۹. ذہبی، ابوعبداللہ شمس الدین محمد بن عثمان، تذکرۃ الحفاظ، مکہ مکرمہ، دارالفکر العربی، (س ن)

۲۰. ذہبی، محمد حسین الدکتور، التفسیر و المفسرون، بغداد، دارالکتب الحدثیۃ، ۱۹۷۶

۲۱. راغب اصفہانی، ابوالقاسم الحسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، بیروت، دارالمعرفۃ

۲۲. زرقانی، محمد عبدالعظیم، مناہل العرفان فی علوم القرآن، بیروت، داراحیاء (س ن)

۲۳. السماحی، محمد محمد، قواعدالتحدیث

۲۴. سیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن، الاتقان فی علوم القرآن، مصر، مصبع مصطفیٰ، ۱۹۲۸

۲۵. ایضاً، تدریب الراوی، بیروت، دارالکتب العلمیۃ

۲۶. ایضاً، المسلسلات الکبریٰ

۲۷. شافعی، محمد بن ادریس، الرسالہ، مصر، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی، تدوین، احمد محمد شاکر

۲۸۔ صدیقی، محمد میاں، تذکرہ مولینا محمد ادریس کاندھلوی لاہور، مکتبہ عثمانیہ

۲۹. عثمانی، ظفراحمد مولینا، اعلاء السنن،کراچی، ادارہ القرآن

۳۰. عجاج، الخطیب، محمد، السنۃ قبل التدوین، قاھرۃ، مکتبہوھبہ

۳۱. عیاض، الشفاء

۳۲۔ محمد ادریس کاندھلوی، مولینا،سیرۃ المصطفیٰ، لاہور، مکتبہ عثمانیہ، ۱۹۹۳، تدوین و فہارس، صدیقی محمد سعد

۳۳. محمد حمید اللہ،الدکتور، مجموعہ الوثائق السیاسیۃ قاہرۃ، لجنۃ التالیف، ۱۹۴۱

۳۴. محمد عبدالباقی ایوبی، المناھل السلسلہ فی احادیث الملسلۃ

۳۵۔ محمد مالک کاندھلوی، مولینا، منازل العرفان فی علوم القرآن، لاہور، ناشران قرآن

۳۶. محمد محمد ابوزھو، الحدیث والمحدثون، قاہرۃ، شرکۃ مساھمۃ مصریۃ، ۱۹۵۸

۳۷. مسلم بن الحجاج القشیری، الجامع الصیحح، بیروت، دار احیاء، تحقیق محمد فواد عبدالباقی

۳۸. ملا علی القاری، الموضوعات

۳۹. نووی، محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف، شرح صیح مسلم، بیروت، دارالفکر، (س ن)